اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان، بہت رحم والا ہے

براہینِ و معجزات کا انسائیکلوپیڈیا

محمد ﷺ کی نبوت اور قرآنِ کریم کی سچائی کے دلائل

سائنسی معجزات · تاریخی و آثاری شواہد · پوری ہونے والی پیشین گوئیاں

تورات و انجیل کی بشارتیں · جِن، جادو اور غیب کی دنیا

اِتنی آسانی سے سمجھایا گیا کہ بچہ بھی سمجھ لے · 157 رنگین خاکے

157 دلائل، قوّت کی ترتیب سے

پہلا باب

عظیم براهین

کتاب کا نچوڑ: کائنات، زمین اور انسان کی نشانیاں اور تاریخ کے شواہد، سب ایک ہی باب میں جمع، اور **سب سے مضبوط دلیل سے ہلکی دلیل کی طرف** ترتیب دیے گئے۔ جو آپ سب سے پہلے پڑھیں گے وہی ہے جس سے بچ نکلنا ممکن نہیں؛ اور جوں جوں آپ باب میں آگے بڑھیں گے، دلیل کا وزن کچھ ہلکا ہوتا جائے گا۔

81 دلائل

پانچ مرحلے... ٹھیک ترتیب کے ساتھ

> پھر ہم نے نطفے کو علقہ بنایا، پھر علقے کو مضغہ بنایا، پھر مضغے کو ھڈیاں بنایا، پھر ہم نے ھڈیوں پر گوشت چڑھایا
>
> **سورہ المؤمنون — آیت 14**

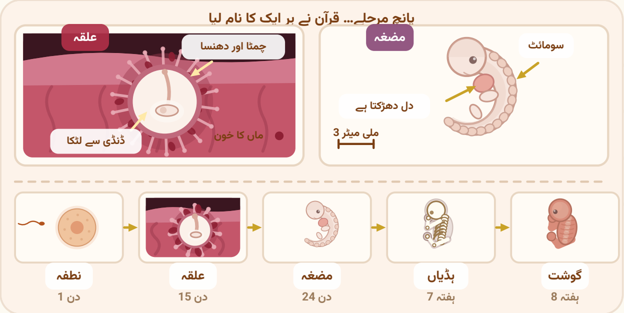

کارنیگی مراحل اور جنین کی اصل تصویروں پر بنایا گیا خاکہ — وہی تناسب، وہی پیمانہ۔ نام اور ترتیب بعینہٖ وہی جو آج کی طبی کتابیں دیتی ہیں

آسان لفظوں میں

پانچ مرحلے، جن کے نام قرآن نے چودہ صدیاں پہلے ایک ایک کر کے لیے: پانی کا ایک قطرہ، پھر **علقہ** — وہ چیز جو رحم کی دیوار میں پیوست ہو جاتی ہے اور پھر اُس میں یوں لٹکی رہتی ہے جیسے پھل ٹہنی سے، پھر **مضغہ** — ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس پر ایسے نشان ہیں **گویا دانتوں نے اُسے چبایا ہو**، پھر ہڈیاں جو ڈالی جاتی ہیں، پھر گوشت جو ہڈیوں کو ڈھانپ دیتا ہے۔ اوپر کا خاکہ **خود جنینوں کی تصویروں سے اُتارا گیا ہے** — اپنی آنکھ سے دیکھیے، پھر لوٹ کر آیت دوبارہ پڑھیے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

رحم کے اندر کیا ہوتا ہے، اِس کا کچھ علم نہ تھا۔ غالب رائے — ارسطو کی، اور اُس کے بعد آنے والے ہر شخص کی — یہ تھی کہ جنین **حیض کے جمے ہوئے خون** سے بنتا ہے۔ جالینوس نے جنین کے بننے کو مرحلوں میں بانٹا اور گوشت کو یوں بیان کیا کہ وہ **ہڈیوں پر اور اُن کے گرد اُگتا ہے** — مگر اُس نے کبھی کوئی انسانی رحم نہ کھولا؛ اُس نے یہ سب جانوروں کی تشریح اور نظری قیاس پر کھڑا کیا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علقہ — تقریباً پہلے دو ہفتے: تین مستند حقیقتیں ایک ساتھ پیش آتی ہیں: جنینی کیسہ **رحم کی دیوار سے چمٹتا ہے اور اُس میں دھنستا چلا جاتا ہے** یہاں تک کہ اُس کے بافت میں دفن ہو جاتا ہے؛ پھر وہ **اپنی تھیلی کے اندر ایک جوڑنے والی ڈنڈی سے لٹکا رہتا ہے** — یہی آپ اوپر کے خاکے میں دیکھ رہے ہیں؛ اور اُس کے گرد **ایسے خلا کھلتے ہیں جنہیں ماں کا خون بھر دیتا ہے**، سو وہ اُس میں گھر جاتا ہے۔

مضغہ — تقریباً چوتھا ہفتہ: جنین کی پشت پر ایسے ٹکڑے نمودار ہوتے ہیں جنہیں **سومائٹ** کہتے ہیں، جو ایک کے بعد ایک بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ چالیس جوڑوں کے قریب پہنچ جاتے ہیں، اور اُن کے بیچ گہری دراڑیں ہوتی ہیں، سو اُس کی سطح نشان دار دکھائی دیتی ہے — اور اُس دن اُس کی لمبائی تین ملی میٹر ہے، جو بغیر تکبیر کے نظر ہی نہیں آتی۔

پھر ہڈیاں، پھر گوشت: ڈھانچہ پہلے غضروفی سانچوں کی صورت میں ڈالا جاتا ہے، پھر پٹھے اُس کے گرد لپٹ کر اپنی شکل اُسی سے لیتے ہیں — پہلے سے موجود کسی چیز پر پوشش، بالکل ویسے ہی جیسے اُس نے فرمایا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اِن دو لفظوں کے پاس ٹھہریے، اِن پر سرسری نہ گزریے۔ **صرف دو لفظ** — «علقہ» اور «مضغہ» — نے اُس چیز کو بیان کیا جس پر کسی انسان کی آنکھ چودہ صدیوں تک نہ پڑی، اور پھر بھی خوردبین اور کیمرے ہی کے ذریعے۔

پہلا: «علقہ»۔ اور اِسے مجھ سے نہ لیجیے — لغتوں سے لیجیے۔ جوہری نے «الصحاح» میں لکھا، اور وہ **ہزار برس پہلے** وفات پا چکے: **«اور علقہ پانی کا وہ کیڑا ہے جو خون چوستا ہے»**۔ بعینہٖ یہی الفاظ «لسان العرب» میں موجود ہیں۔ اور خود اِس لفظ کا مادہ **پیوست ہونے اور چمٹنے** پر گھومتا ہے، اور **لٹکنے اور معلق رہنے** پر۔

اب نظر اٹھائیے اِس صفحے کے اوپر والے خاکے کی طرف۔ آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ ایک ایسی مخلوق دیکھ رہے ہیں جو رحم کی دیوار میں **پیوست ہوئی** اور اُس میں اِس قدر دھنسی کہ اُس کے گوشت میں چھپ گئی؛ پھر اپنی تھیلی کے اندر ایک ڈنڈی سے **لٹک گئی**، جیسے پھل ٹہنی سے لٹکتا ہے؛ اور **اُس کی ماں کا خون ہر طرف سے اُسے گھیرے ہوئے ہے**۔ ایک ہی نام نے تینوں کو ایک ساتھ جا لیا۔ **تو کس نے اُسے خبر دی؟**

دوسرا: «مضغہ»۔ اور یہ **چبانے** سے ہے۔ خالد بن جنبہ کہتے ہیں، جیسا کہ «لسان العرب» میں ہے: **«گوشت کا مضغہ اُتنا ہے جتنا آدمی اپنے منہ میں ڈالتا ہے»** — ایک لقمہ جو چبایا جائے۔ پھر چودہ صدیاں بعد خوردبین آتی ہے اور چوتھے ہفتے کے جنین کی تصویر لیتی ہے، اور جامعہ کی درسی کتاب «نمو پاتا ہوا انسان» کہتی ہے کہ یہ ٹکڑے اُس کی پشت پر **باہر سے موتیوں جیسے اُبھار دکھائی دیتے ہیں**، اور اُن کے بیچ گہری دراڑیں ہیں۔ خاکے کو دیکھیے: گویا دو جبڑوں کے بیچ دبایا گیا ہو! اور یاد رکھیے کہ اُس دن اُس کی لمبائی **تین ملی میٹر** ہے — نہ کوئی آنکھ اُسے دیکھتی ہے، اور نہ اُس کی شکل ایسی تکبیر کے بغیر پہچانی جا سکتی ہے جو اُس دن پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔

اور تیسرا: ہڈیاں، پھر گوشت۔ کون سا انسان کسی نرم لوتھڑے کو دیکھ کر کہے گا: پہلے ہڈی؟! عقل تو اِس کے اُلٹ کہتی ہے۔ مگر علم کہتا ہے: ہاں، ڈھانچہ پہلے ڈالا جاتا ہے، پھر پٹھے اُس کے گرد لپٹ کر اپنی شکل اُسی سے لیتے ہیں۔ اور یہ بعینہٖ اُس کا فرمان ہے: **«پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا»** — اور پوشش تو اُسی پر پڑتی ہے جو پہلے سے موجود ہو!

ایک ہی آیت میں چار پے در پے لفظ۔ **چار پے در پے ضربیں۔** اِن میں سے ہر ایک تنہا کافی تھی کہ اگر چوک جاتی تو پورے متن کو گرا دیتی — اور ایک بھی نہ چوکی۔ ریگستان کا ایک اُمّی شخص، جو نہ پڑھتا تھا نہ لکھتا، ایسے مرحلوں کے نام لیتا ہے جو آنکھ سے دکھائی ہی نہیں دیتے... اور ایک ایک کو اُس کے نام سے جا لیتا ہے۔ **تو اُسے کس نے سکھایا؟**

ماخذ Moore & Persaud — *The Developing Human* · O'Rahilly & Müller — *Developmental Stages in Human Embryos*, 1987

اندھیرے، ایک کے اوپر ایک

یا اُن اندھیروں کی مانند جو گہرے سمندر میں ہوں، جنہیں موج ڈھانپے، اُس کے اوپر موج، اُس کے اوپر بادل — اندھیرے، ایک کے اوپر ایک

سورہ النور — آیت 40

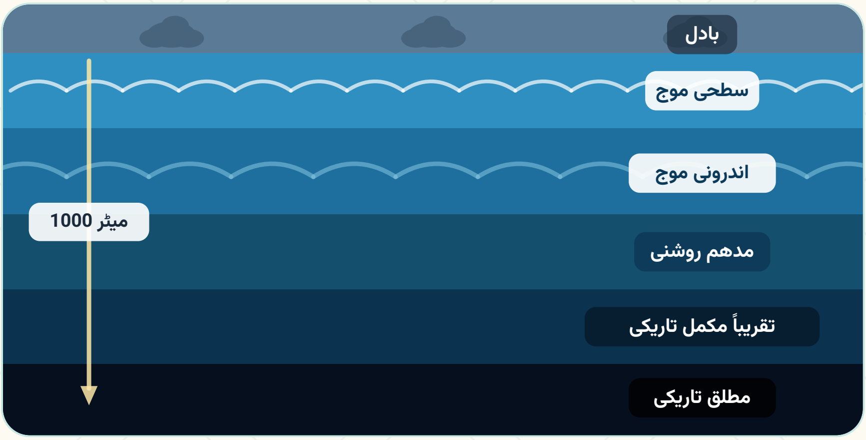

روشنی تہ در تہ نگلی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک ہزار میٹر سے نیچے بالکل غائب ہو جائے

آسان لفظوں میں

سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرے پر اندھیرا ہے: بادل روکتا ہے، پھر موج روکتی ہے، پھر پانی رنگوں کو ایک ایک کر کے نگل جاتا ہے، یہاں تک کہ کوئی روشنی باقی نہیں رہتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کوئی انسان سانس روک کر چند میٹر سے زیادہ گہرائی میں نہ اُتر سکا تھا۔ سمندر کی گہرائیاں سراسر نامعلوم تھیں۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ وہاں کا اندھیرا **درجہ بہ درجہ تہوں** میں ہے، اور نہ یہ کہ نظر آنے والی موج کے نیچے ایک اور موج ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پانی میں روشنی مرحلہ وار جذب ہوتی ہے: سرخ رنگ تقریباً 15 میٹر پر غائب ہو جاتا ہے، پھر نارنجی، پھر زرد، پھر سبز، اور صرف مدھم نیلا باقی رہتا ہے، وہ بھی تقریباً 200 میٹر پر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک ہزار میٹر سے نیچے **مکمل تاریکی ہے، ایک فوٹون بھی نہیں**۔ سائنس نے **اندرونی موجیں** بھی دریافت کیں، جو مختلف کثافت والی پانی کی تہوں کی سرحدوں پر چلتی ہیں — موجوں کے نیچے موجیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے تین پردے صحیح ترتیب سے اوپر سے نیچے رکھے: بادل، پھر موج، پھر **اُس کے نیچے ایک اور موج**۔ سمندر کی سطح کے نیچے دوسری موج کا وجود ایسی حقیقت ہے جو بیسویں صدی سے پہلے معلوم نہ تھی۔ پھر جامع وصف پر بات ختم کی: «اندھیرے، ایک کے اوپر ایک» — یعنی **تہ بہ تہ چڑھا ہوا اندھیرا**، ایک اندھیرا نہیں۔ اور یہی پانی میں روشنی کے جذب ہونے کا عین طبیعی بیان ہے۔

مآخذ Sverdrup, Johnson & Fleming — *The Oceans*, 1942 · NOAA — light in the ocean

بارش بننے کے تین مرحلے

> کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو ہانکتا ہے، پھر آپس میں جوڑتا ہے، پھر ڈھیر بنا دیتا ہے، تو آپ دیکھتے ہیں کہ بارش اُس کے بیچ سے نکلتی ہے
>
> **سورہ النور — آیت 43**

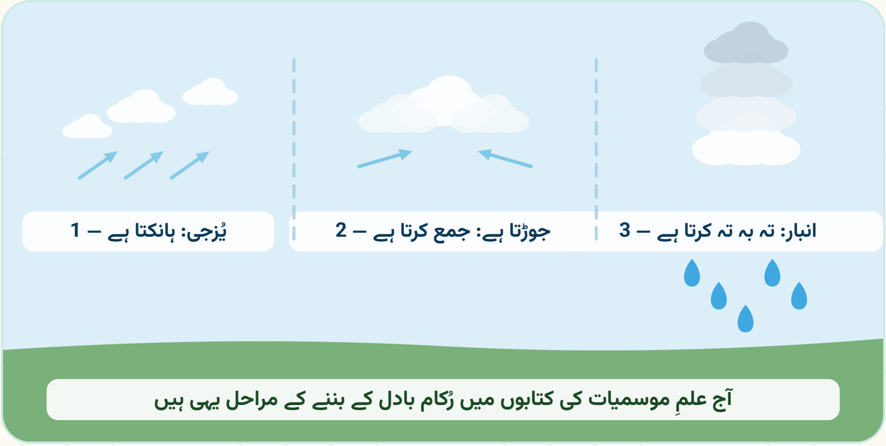

ہانکنا، پھر جوڑنا، پھر عمودی ڈھیر لگنا… اور پھر بارش اُترتی ہے

آسان لفظوں میں

بارش اچانک نہیں اُترتی۔ اُس کے تین مرحلے ترتیب سے ہیں: ہوا بادل کے چھوٹے ٹکڑوں کو **ہانکتی** ہے، پھر اُنہیں آپس میں **جوڑتی** ہے، پھر اُنہیں پہاڑ کی طرح ایک دوسرے پر **ڈھیر کرتی** ہے — تب بارش ہوتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش ایک ہی واقعہ تھا: بادل، پھر پانی۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ بادل کے **بننے کے مرتب مرحلے** ہیں، اور نہ یہ کہ برسنے والا بادل نہ برسنے والے بادل سے ساخت میں مختلف ہوتا ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علمِ موسمیات میں **رُکام (Cumulonimbus)** بادل کی پیدائش کے بارے میں یہی پڑھایا جاتا ہے: ہوائی دھارے چھوٹے بادلی خلیوں کو ہانک لاتے ہیں، پھر یہ خلیے آپس میں مل جاتے ہیں، پھر یہ تودہ ڈھیر بنتی تہوں میں عمودی بڑھتا ہے یہاں تک کہ 15 کلومیٹر بلند ہو جائے۔ **اِسی مرحلے پر** قطرے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ گر سکیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تین پے در پے افعال، «ثُمّ» کے ساتھ جو ترتیب اور وقفے پر دلالت کرتا ہے: «ہانکتا ہے» (نرمی سے چلاتا ہے) ← «آپس میں جوڑتا ہے» (ٹکڑوں کو ملاتا ہے) ← «ڈھیر بنا دیتا ہے» (عمودی طور پر تہ بہ تہ کرتا ہے)۔ یہ ایسی ترتیب ہے جو **نہ اُلٹی جا سکتی ہے نہ مختصر**، اور یہی عین سائنسی ترتیب ہے۔ پھر آخری باریکی آئی: بارش **«اُس کے بیچ سے»** نکلتی ہے — یعنی تودے کے اندر کے شگافوں اور موڑوں سے، اُس کے نیچے سے نہیں۔ اور ریڈار کی تصویریں یہی دکھاتی ہیں۔

مآخذ: NOAA — thunderstorm basics · World Meteorological Organization — *International Cloud Atlas*

«کھجور کی پرانی شاخ کی طرح»... چاند کے بارے میں کہی گئی سب سے باریک تشبیہ

> اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرّر کیں، یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کی طرح لوٹ آتا ہے۔
>
> سورہ یٰسین — آیت 39

دو لفظوں میں چار صفتیں: خمیدہ، باریک، زرد، اور دورے کے آخر میں

آسان لفظوں میں

عُرجون وہ ٹہنی ہے جس سے کھجور کے خوشے لٹکتے ہیں۔ جب وہ پرانی ہو جائے تو **سوکھ جاتی ہے، باریک ہو جاتی ہے، جھک جاتی ہے اور زرد پڑ جاتی ہے**۔ اور قرآن نے مہینے کے آخر کے چاند کو اِسی سے تشبیہ دی — اور یہ بالکل وہی وقت ہے جب وہ ایک باریک، خمیدہ، پھیکا دھاگا بن جاتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

چاند کی منزلیں ہر کوئی دیکھتا ہے، سو بات یہ نہیں کہ اُنہیں معلوم تھا چاند گھٹتا ہے۔ بات **وصف کی باریکی اور مشبّہ بہ کے انتخاب** کی ہے۔ عربوں نے اپنے شعر میں ہلال کو بہت سی چیزوں سے تشبیہ دی — درانتی سے، کشتی سے، ناخن کی کترن سے — اور اِن میں سے ہر ایک صرف ایک صفت پکڑتی ہے: **خمیدگی**۔ نہ رنگ پکڑتی ہے، نہ خشکی، نہ دورے میں اُس منزل کی جگہ۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قمری مہینہ **29.5 دن** کا ہے، اور چاند اُسے گنی ہوئی منزلوں میں طے کرتا ہے جن سے کبھی نہیں ہٹتا؛ اور ہر رات اُس کی شکل **اُس کے مقام** کی نشانی ہے، خود اُس کی کسی چیز کی نہیں۔ اور مہینے کے آخر میں اُس کا روشن حصّہ گھٹ کر **1% سے بھی کم** رہ جاتا ہے، سو وہ نہایت باریک کمان بن جاتا ہے جس کے دونوں سرے پتلے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

پھر ایک صفت جس پر رصد کرنے والے کے سوا کسی کی نظر نہیں جاتی: مہینے کے آخر کا ہلال **صرف مشرقی اُفق کے قریب، طلوعِ فجر سے ذرا پہلے دکھائی دیتا ہے** — آسمان کے بیچوں بیچ کبھی نہیں۔ اور اُفق کے قریب سے آنے والی روشنی ہوا کی ایک موٹی تہ سے گزرتی ہے جو نیلے کو روک لیتی ہے اور زرد اور سرخ کو گزار دیتی ہے — **سو وہ پھیکا زرد دکھائی دیتا ہے**۔ اور یہ بعینہٖ سوکھے عُرجون کا رنگ ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تشبیہ میں جو قیدیں رکھی گئی ہیں اُنہیں جمع کیجیے: **خمیدہ**، اور **باریک، جس کے دونوں سرے پتلے ہوتے جائیں**، اور **پھیکا زرد**، اور **دورے کے آخر میں، اُس کے شروع میں نہیں**۔ دو لفظوں میں چار قیدیں، اور چاروں نشانے پر۔

اور چوتھی قید سب سے باریک ہے۔ قرآن نے «ہلال» نہیں کہا — جو مہینے کے آغاز کا رائج نام ہے — بلکہ کہا **«لوٹ آیا»**، یعنی اُس حال کی طرف پلٹا جس پر وہ پہلے تھا؛ اور مشبّہ بہ کو **«پرانا»** کہا۔ سو پرانا پن پرانے پن سے ملا، اور لوٹنا دورے سے۔ اِسی لیے مفسّرین نے، رصد کے بارے میں کچھ معلوم ہونے سے پہلے، کہا: یہ مہینے کے آخر کا چاند ہے، **اُس کے چھپ جانے سے ذرا پہلے**۔

پھر یہ کہ مشبّہ بہ کسی سے دور نہ تھا: **مدینے کے ہر گھر میں عُرجون موجود تھا**۔ سو یہ تشبیہ جزیرۂ عرب کی ہر آنکھ کے سامنے کھلی پڑی تھی، اور اگر ایک صفت میں بھی چوک جاتی تو مخالفوں کے شاعر اُسی دن اُسے اُچک لیتے — وہی لوگ جنہوں نے اِس سے ہلکی باتوں پر طعن کیا۔ اُن میں سے کسی ایک سے بھی اِس حرف پر کوئی اعتراض نقل نہیں ہوا۔

اور یہاں ایک حد پر رُک جائیے: ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ آیت منزلوں کا سبب سکھاتی ہے؛ انکساغورس مسیح سے چار صدیاں پہلے طے کر چکا تھا کہ چاند سورج کی روشنی لوٹاتا ہے۔ ہم جو کہتے ہیں وہ تنگ تر اور مضبوط تر ہے: یہ کہ **دو لفظوں کے ایک وصف نے چار الگ الگ طبیعی صفتیں ایک جگہ جمع کر دیں** — شکل، رنگ، باریکی، اور دورے میں مقام — اور چاروں پر ٹھیک بیٹھا۔ اور یہ کام قسمت سے نہیں ہوتا۔

مآخذ تفسير الطبري — سورة يس ٣٩ · تفسير ابن كثير — سورة يس ٣٩ · Stanford Encyclopedia of Philosophy — *Anaxagoras* · FAO — *Botanical Description of the Date Palm* · NASA Science — *Moon Phases*

تین سو ساٹھ جوڑ… تشریح سے پہلے گنے گئے

> بنی آدم میں سے ہر انسان تین سو ساٹھ جوڑوں پر پیدا کیا گیا ہے
>
> مسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا — صحیح · اور بُریدہ سے اس کا ایک صحیح شاہد بھی ہے

ہر وہ جگہ جہاں دو ہڈیاں ملتی ہیں… گنی ہوئی اور نام والی

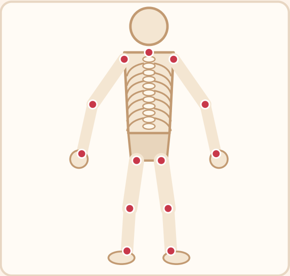

ریڑھ کی ہڈی	147
پسلیوں کا پنجرہ	24
دونوں بالائی اعضا	86
دونوں زیریں اعضا	88
پیڑو	15
360 جوڑ	

ایک صریح عدد جو تاویل کا محتمل نہیں — پہلے باریک تشریحی اطلس سے نو صدیاں پہلے کہا گیا

آسان لفظوں میں

آپ کے بدن میں **تین سو ساٹھ جوڑ** ہیں — یہ بنیادی عدد ہے، اور ایک انسان سے دوسرے تک تھوڑا سا بڑھتا گھٹتا ہے۔ نبی ﷺ نے یہ چودہ صدیاں پہلے فرمایا، اور ان میں سے ہر جوڑ کے ساتھ **ایک صدقہ لگا دیا جو ہر روز ادا کیا جائے**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرۂ عرب میں نہ تشریح تھی نہ طب کے مدرسے، اور انسان کی تشریح بیشتر قدیم تہذیبوں میں حرام تھی، یہاں تک کہ **جالینوس** نے اپنی ساری تشریح بندروں اور خنزیروں پر کھڑی کی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بدن کے جوڑ ایک ایک کر کے گنے گئے — ہر وہ مقام جہاں دو ہڈیاں ملتی ہیں، خواہ وہ حرکت کرتا ہو یا ٹھہرا ہوا ہو — ڈاکٹر **حامد احمد حامد** کی تفصیل کے مطابق: **ریڑھ کی ہڈی 147، پسلیوں کا پنجرہ 24، دونوں بالائی اعضا 86، دونوں زیریں اعضا 88**، اور **پیڑو 15**۔ مجموعہ: **تین سو ساٹھ**۔
اور گنتی دو چیزوں کے تابع ہے: تعریف، اور بدن۔ جس نے صرف حرکت کرنے والے گنے وہ کم رہ گیا۔ پھر خود بدن بھی تھوڑا بہت مختلف ہوتے ہیں: **زائد ہڈّیاں** تقریباً 26% لوگوں میں ہوتی ہیں، **انتقالی مہرہ** 15% میں، اور **تلوں جیسی ہڈّیاں** 8% میں۔ سو **تین سو ساٹھ ایک صحیح سالم بدن کا بنیادی عدد ہے**، ہر انسان میں ایک جامد گنتی نہیں۔ اور پہلا باریک تشریحی اطلس 1543ء ہی میں **ویسالیئس** کے ہاتھوں سامنے آیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ یہ کس قسم کی خبر ہے: نہ کوئی ایسا وصف جو تاویل کا محتمل ہو، نہ کوئی تشبیہ — بلکہ ایک **عدد**؛ یا تو ٹھیک بیٹھے گا یا گر جائے گا۔ اگر سلامتی مقصود ہوتی تو فرما دیتے «بہت سے جوڑ»۔ مگر فرمایا: **تین سو ساٹھ**، ایسے بدن کے بارے میں جو کبھی کھولا نہ گیا تھا، اور ایسے جزیرے میں جہاں نہ کوئی نشتر تھا نہ طب کا کوئی مدرسہ۔

اور سب سے عجیب بات یہ ہے کہ یہ عدد اپنے آپ کے لیے ذکر ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ایک عمل کے سیاق میں آیا: ان میں سے ہر جوڑ پر **ہر روز ایک صدقہ** ہے۔ سو یہ عدد حکم کا ستون ہے، کلام کی زینت نہیں؛ اور اگر یہ غلط ہوتا تو حکم بھی اس کے ساتھ گر جاتا۔

اور کہا جا سکتا ہے: شاید مراد انگلیوں کی ہڈّیاں ہوں — کہ لغت میں «سُلامیٰ» کی اصل یہی ہے۔ خود حدیث اس بات کو کاٹ دیتی ہے: آپ ﷺ نے فرمایا «تین سو ساٹھ **مَفصِل** پر»، پھر اُسی جملے میں لوٹ کر اسی کو «**سُلامیٰ**» کا نام دیا۔ ایک ہی متن میں ایک ہی معدود کے لیے دو لفظ — **سو حدیث ہی نے سُلامیٰ کی تفسیر جوڑوں سے کی ہے**۔ اور «مَفصِل» دو ہڈیوں کے ملنے کا مقام ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں؛ اسی لیے صحیح مسلم کے تراجم اسے *joints* نقل کرتے ہیں — بدن کے جوڑ، نہ کہ انگلیوں کی ہڈّیاں۔

اور دوسری بات یہ کہی جاتی ہے: شاید یہ آپ تک چین کی طب سے پہنچا ہو. ہم اسے جوں کا توں کہتے ہیں: ہاں، یہ عدد چین کی قدیم کتابوں میں موجود ہے — «لِنگ شُو» کہتی ہے: «سال میں تین سو پینسٹھ دن ہیں، اور بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں»۔ اور خود یہی کتاب بتاتی ہے کہ عدد آیا کہاں سے: **تقویم** سے، بدن سے نہیں۔
اور سوال باقی رہتا ہے: یہ بات **جزیرۂ عرب کے صحرا میں ایک اُمّی شخص** تک پہنچے تو کیسے؟ اس کی کوئی راہ ہی نہیں — اور دونوں کے درمیان تین رکاوٹیں حائل ہیں:
1 — کوئی راستہ نہیں. پہلا اسلامی سفارتی وفد چین 651ء میں پہنچا — آپ ﷺ کی وفات کے اُنیس برس بعد۔
2 — اور کوئی ترجمہ نہیں. چینی طب کی پہلی کتاب جو کسی بھی زبان میں باہر آئی وہ «تنکسوق نامہ» ہے، 1313ء میں — حدیث کے سات صدیاں بعد۔
3 — اور خود کتاب گم تھی. «لِنگ شُو» خود چین ہی سے گم ہو گئی تھی، یہاں تک کہ سونگ دربار نے 1091ء میں کوریا سے اس کی درخواست کی اور 1093ء میں اسے پایا — **یعنی حدیث کے ساڑھے چار صدیاں بعد۔**
ایک اُمّی شخص جس نے کبھی کوئی بدن نہیں کھولا، اپنی امت کو ایک تشریحی عدد دیتا ہے جس پر ایک عبادت کھڑی کی جاتی ہے… پھر جدید تشریح نو صدیاں بعد اسے گن کر وہی پاتی ہے۔ **تو اسے یہ گن کر کس نے دیا؟**

مآخذ صحیح مسلم ١٠٠٧أ — «مَفصِل» و«سُلامى» في نصٍّ واحِد · Stanford Encyclopedia of Philosophy — *Chinese Philosophy and Chinese Medicine* · Cleveland Clinic — *Joints* · د. حامد أحمد حامد — «رِحلةُ الإيمانِ في جِسمِ الإنسان» · رشید الدین — «تَنکسوق نامه»، ١٣١٣م — Köstenbauer, *ANZ J. Surg.* 2017

دم کی هڈی… اسی سے انسان بنایا گیا

> ابنِ آدم کا هر حصه مٹی کھا جاتی هے سوائے عَجْبُ الذَّنَب کے، اسی سے وہ پیدا کیا گیا اور اسی میں وہ دوبارہ جوڑا جائے گا
>
> بخاری اور مسلم نے روایت کیا – متفق علیہ

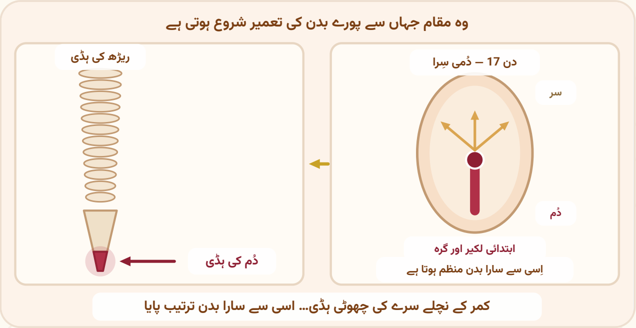

ابتدائی لکیر جنین کے دُمی سرے پر نمودار ہوتی ہے، اور اسی سے سارے محور اور ساری تہیں بنتی ہیں

آسان لفظوں میں

عَجْبُ الذَّنَب **ریڑھ کی ہڈی کے بالکل نچلے سرے کی چھوٹی ہڈی** ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ انسان **اسی سے پیدا کیا گیا**۔ اور آج علمِ جنین کہتا ہے: پورے بدن کی تعمیر **ایک ایسی لکیر سے شروع ہوتی ہے جو جنین کے دُمی سرے پر نمودار ہوتی ہے**، اور اس کے سرے پر ایک گرہ ہے جسے **«منظّم»** کہتے ہیں — اسی سے تینوں تہیں اور بدن کے سارے محور ترتیب پاتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جنین کے بارے میں اس کے پہلے مرحلے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا؛ وہ دو ملی میٹر سے بھی کم ہوتا ہے، کوئی آنکھ اسے پکڑ نہیں سکتی۔ رہی عُصعُص کی ہڈی، تو اسے **ایک بے کار بچی ہوئی چیز** سمجھا جاتا تھا — ایک سکڑی ہوئی دُم؛ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اہلِ علم نے اسے «اثری اعضا» کی اُس فہرست میں شمار کیا جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ سو اسی مقام کو **تخلیق کی اصل** ٹھہرانا خود بداہت کے خلاف ایک بات ہے: عقل سر سے شروع کرتی ہے یا دل سے، کمر کے نچلے سرے سے نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سترہویں دن جنینی قرص میں ایک لکیر نمودار ہوتی ہے جسے **ابتدائی لکیر** کہتے ہیں، اور اس کا مقام جنین کا **دُمی سرا** ہے۔ اور اس کے سرے پر **ابتدائی گرہ** ہے، وہی جسے علمِ جنین میں «**منظّم**» کہا جاتا ہے: یہ دونوں پہلوؤں کے درمیان تناظر قائم کرتی ہے، تہ بندی کا مقام متعین کرتی ہے، تینوں جرثومی تہیں اسی سے شروع ہوتی ہیں، اور بدن کے محور اسی سے کھینچے جاتے ہیں: سر دُم سے، اور دایاں بائیں سے۔
اور **شپیمان اور مانگولڈ** نے 1924ء میں ثابت کیا کہ اکیلی **ثقبِ ارومی کی پشتی لب** — جو سلامینڈر کے جنینوں میں اسی گرہ کی ہم منصب ہے — کسی دوسرے جنین میں منتقل کر دی جائے تو وہ میزبان ہی کے خلیوں سے **ایک دوسرا جنینی محور** بنوا دیتی ہے، اپنی عصبی نالی، اپنے پشتی رَسّے اور اپنے قطعوں سمیت — اور شپیمان کو اس پر 1935ء میں نوبیل ملا۔
پھر یہ لکیر سمٹ جاتی ہے اور اس کا باقی حصہ بیسویں دن **دُم کی کونپل** بن جاتا ہے۔ اور اس کا ایک معروف طبی تعلق باقی رہتا ہے: **عُصعُصی مسخی رسولی** کو ابتدائی لکیر کے بقایا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اور اس کی جراحی میں صرف رسولی نکالنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا — بلکہ **عُصعُص بھی اس کے ساتھ نکال دیا جاتا ہے**، کیونکہ اسے چھوڑ دینا ہی رسولی کو لوٹا لاتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

صرف حرفِ جر پر نظر ڈالیے۔ نہ فرمایا «اُس میں پیدا کیا گیا» اور نہ «سب سے پہلے یہی پیدا کیا گیا»، بلکہ **«اسی سے پیدا کیا گیا»** — سو اس مقام کو ایسا **سرچشمہ** ٹھہرا دیا جس سے عمارت نکلتی ہے۔ اور یہ بعینہٖ منظّم کی تعریف ہے: یہ پہلا بننے والا عضو نہیں، بلکہ وہ مقام ہے جس سے باقی اعضا **ترتیب پاتے ہیں**۔
پھر اُس مقام کو دیکھیے جو چنا گیا: کمر کا نچلا سرا۔ ساتویں صدی کے مشاہدے میں کوئی چیز اسے تخلیق کی اصل کہنے پر آمادہ نہیں کرتی، بلکہ ہر چیز اس سے ہٹاتی ہے۔ اور اسے کسی کے دیکھنے کی کوئی صورت بھی نہ تھی: سترہویں دن کا جنین اتنا چھوٹا ہے کہ ننگی آنکھ اسے پکڑ نہیں سکتی۔
اور یہاں ہم ایک ایسی حد پر رکتے ہیں جس کا کہنا ضروری ہے۔ حدیث کا دوسرا حصہ — **«اور اسی میں وہ دوبارہ جوڑا جائے گا»** — بعث کی خبر ہے، اور یہ ایک غیبی معاملہ ہے جس تک کوئی تجربہ نہیں پہنچتا، اور ہم یہاں اس پر کچھ نہیں بناتے۔ اور جو یہ مشہور کیا جاتا ہے کہ سائنس نے «ثابت کر دیا کہ عُصعُص فنا نہیں ہوتا»، تو ہمیں اس کی تائید میں کوئی شائع شدہ محکّم تحقیق معلوم نہیں — **اور جس بات کی کوئی دلیل نہ ہو اسے چھوڑ دینا دلیل کو اس سے بڑھانے کے مقابلے میں زیادہ نفع بخش ہے**۔ سو سارا وزن پہلے حصے میں ہے: بدن کے ایک مقام کے بارے میں ایک مختصر جملہ، جانچا جا سکنے والا، جو خوردبین سے ایک ہزار برس پہلے کہا گیا… اور پورا اترا۔ **تو اسے اس کا پتا کس نے دیا؟**

مآخذ Spemann & Mangold (1924) — the organizer · Nobel Prize in Physiology or Medicine 1935 · Moore & Persaud — *The Developing Human*

بیالیس راتیں... پھر صورت ظاہر ہوتی ہے

> جب نطفے پر بیالیس راتیں گزر جاتی ہیں تو اللہ اُس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے جو اُسے صورت دیتا ہے، اور اُس کی سماعت اور بصارت، اُس کی کھال، گوشت اور ہڈیاں پیدا کرتا ہے
>
> **مسلم کی روایت — صحیح**

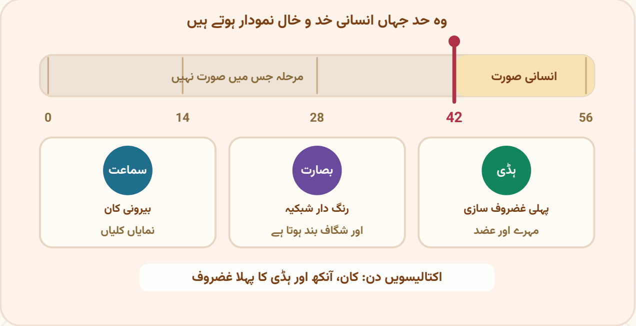

ایک انوکھا عدد، جو صرف اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہی مراد ہے — چالیس نہیں، بیالیس

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے فرمایا کہ نطفے پر جب **بیالیس راتیں** گزر جائیں تو اُسے صورت دی جاتی ہے، اور اُس میں سماعت، بصارت، کھال، گوشت اور ہڈی پیدا کی جاتی ہے۔ اور علمِ جنین آج ٹھیک اِسی دن پر ایک **حد** رکھتا ہے: اِس سے پہلے صورت میں کوئی چیز انسانی جنین کو دوسروں سے الگ نہیں کرتی، اور اِسی پر انسانی نقوش ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کسی کے پاس کوئی راستہ نہ تھا کہ بیالیسویں دن کے جنین کو دیکھ سکے: اُس کی لمبائی تقریباً **بارہ ملی میٹر** ہوتی ہے، اور وہ رحم کے اندر ہے۔ یونانیوں کے ہاں تشکیل کا ایک مشہور وقت مقرر تھا: **ارسطو** نے «تاریخُ الحیوان» میں یہ طے کیا کہ نر جنین **چالیسویں دن** پہچانا جاتا ہے اور مادہ **نوّے ویں دن**، اور اُس سے پہلے وہ «ایک گوشت نما مادہ ہے جس میں اجزا کی کوئی جدائی نہیں»۔ اور یہ وقت اپنے دونوں حصوں میں غلط ہے: تشکیل کے وقت میں نر و مادہ کا کوئی فرق نہیں، اور تناسلی اعضا بارہویں ہفتے سے پہلے پہچانے نہیں جاتے۔ اِس کے باوجود ارسطو نے ہزار سال طب اور قانون پر حکومت کی۔ اور جنین کی نشو و نما کا درست زمانی نقشہ بیسویں صدی سے پہلے وجود میں نہ آیا، جب **کارنیگی مراحل** دنوں میں شمار کی گئی عمروں پر ترتیب دیے گئے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

کارنیگی کے مراحل میں سترہواں مرحلہ باروری سے **اکتالیس دن** کی عمر رکھتا ہے، اور اُس میں جنین کی لمبائی 11 تا 14 ملی میٹر ہوتی ہے۔ اور ٹھیک اِسی مرحلے میں:
– **کان**: کان کی چھ کلیاں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بیرونی کان کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔
– **آنکھ**: شبکیہ کی رنگت صاف ظاہر ہو جاتی ہے، شگافِ شبکیہ بند ہوتا ہے، اور عدسے کے ریشے بنتے ہیں۔
– **ہڈی**: مہروں کے جسموں میں اور عضد و کعبرہ کی ہڈیوں میں غضروف بننا شروع ہوتا ہے۔ اور ہنسلی — پورے بدن کی وہ پہلی ہڈی جو سخت ہوتی ہے — اُس کی استخوان بندی کا مرکز اِسی **چھٹے ہفتے** میں ظاہر ہوتا ہے۔
اور **برٹانیکا** اِس مدت کے بیان میں کہتا ہے کہ چوتھے ہفتے میں جنین ایک ممالیہ کے طور پر پہچانا جانے لگتا ہے، پھر: «**دوسرے مہینے کے آخری ہفتوں میں تبدیلیاں اُن سے آگے بڑھتی ہیں جو پرائمیٹس کو ممتاز کرتی ہیں، اُس حالت کی طرف جس میں وہ پہچانے جانے کے قابل انسان ہے**»۔ اور دوسرے مہینے کے آخری ہفتے بیالیسویں دن سے شروع ہوتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں باریکی **اُس انوکھے عدد** میں ہے۔ اگر کہنے والا کوئی خوشگوار عدد چاہتا تو چالیس کہتا — وہ عدد جو ہر بات میں عربوں کی زبان پر چڑھا ہوا تھا، **اور وہی عدد اُس زمانے کی طب میں تیار پڑا تھا**: ارسطو کے ہاں چالیس دن، اور اُس کے بعد ہزار سال تک طب اور قانون میں۔ سو اگر یہ نقل ہوتی یا رائج بات کی موافقت، تو چالیس ہی آتا۔ مگر اُنھوں نے **بیالیس** کہا؛ ایسا عدد جو صرف اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہی مراد ہے، اور ایسے کلام میں بے سبب نہیں چنا جاتا جو یاد کیا اور آگے پہنچایا جاتا ہے۔ پھر ارسطو نے نر و مادہ میں فرق کیا اور غلطی کی، اور حدیث نے فرق نہ کیا اور ٹھیک کہا۔
پھر دیکھیے کہ اِس دن کے ساتھ کیا باندھا گیا: **صورت گری**۔ نہ زندگی، نہ حرکت، نہ دھڑکن — بلکہ صورت۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے علمِ جنین اِسی حد پر رکھتا ہے: اِس سے پہلے انسانی جنین کی صورت باقی ریڑھ دار جانوروں کے جنین سے الگ نہیں کی جا سکتی، اور اِس کے بعد نقوش ظاہر ہو جاتے ہیں۔
پھر ترتیب دیکھیے: **اُس کی سماعت اور بصارت** — سماعت پہلے۔ اور یہی ترتیب ہے جسے قرآن نے ہر اُس مقام پر نبھایا جہاں اِن دونوں کا ذکر کیا۔
اور اُسی ہفتے میں وہ تینوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں جن کا نام حدیث نے لیا: کان بنتا ہے، شبکیہ رنگ پکڑتا ہے، اور پہلی ہڈی اپنا مرکز باندھتی ہے۔ **تین مختلف نظام اپنی حد ایک ساتھ عبور کرتے ہوئے۔**
اور ایک حد پر ٹھہر جائیے: فرشتہ جو کرتا ہے وہ غیب ہے، خوردبین سے ناپا نہیں جاتا، اور ہم یہاں اُس پر کچھ بنا نہیں رہے۔ جو ناپا جاتا ہے وہ **وقت** ہے: ایک گنی ہوئی معیّن رات، ایسے بدن میں جو دکھائی نہ دیتا تھا، خوردبین بننے سے ہزار سال پہلے کہی گئی... اور ٹھیک نکلی۔ **تو اُنہیں اِس کی خبر کس نے دی؟**

مآخذ *Britannica* — “Prenatal development” · O’Rahilly & Müller — Carnegie stage 17 · Aristotle — *History of Animals*, VII

آپ میں سے کوئی ٹھہرے پانی میں پیشاب نہ کرے

آپ میں سے کوئی اُس ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے جو بہتا نہیں، پھر اُس میں غسل کرے

بخاری اور مسلم کی روایت — متفق علیہ

بلہارزیا کا چکر — اور اُس کے دونوں سرے ہی ممنوع ہیں

1. مریض ٹھہرے پانی میں پیشاب کرتا ہے — اُس میں انڈے ہیں
2. انڈا صرف میٹھے پانی میں پھوٹتا ہے
3. لاروا اُس گھونگھے میں جو صرف ٹھہرے پانی میں رہتا ہے
4. لاروے نکل کر نہانے والے کی جلد چیرتے ہیں

ایک ہی جملے میں چکر کے آغاز اور انجام سے منع کیا

ایسی قید جس کا کوئی مطلب نہ ہوتا اگر ممانعت محض گندگی کی وجہ سے ہوتی: «ٹھہرا ہوا پانی جو بہتا نہیں»

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے **دو باتوں سے ایک ساتھ** منع فرمایا: یہ کہ آدمی ایسے ٹھہرے پانی میں پیشاب کرے جو بہتا نہیں، اور یہ کہ پھر اُسی میں غسل کرے۔ اور یہی دونوں **بلہارزیا** کے چکر کے ٹھیک دو سرے ہیں — مصر اور جزیرۂ عرب کا سب سے پھیلا ہوا طفیلی کیڑا: اُس کے انڈے **پیشاب کے ساتھ** نکلتے ہیں، **میٹھے ٹھہرے پانی** کے سوا نہیں پھوٹتے، اور پھر انسان کے اندر **اُس کی کھال سے** داخل ہوتے ہیں جب وہ پانی میں اُترتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کوئی نہیں جانتا تھا کہ پیشاب بیماری منتقل کرتا ہے، نہ یہ کہ پانی میں کوئی چیز ہے جو کھال سے اندر داخل ہو جاتی ہے۔ بلکہ ٹھہرا ہوا تالاب پینے اور نہانے دونوں کا گھاٹ تھا۔ اور اُس کیڑے کو اپنی آنکھ سے دیکھنے والا پہلا شخص جرمن طبیب **تیوڈور بلہارٹس** تھا، قاہرہ کے قصر العینی اسپتال میں، سن **1851** میں۔ رہا یہ کہ وہ منتقل کیسے ہوتا ہے، تو یہ اُس کے بعد **چونسٹھ سال** تک نامعلوم رہا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

یہ چکر جیسا کہ عالمی ادارۂ صحت بیان کرتا ہے:

1 — بیمار شخص اپنے پیشاب سے میٹھا پانی آلودہ کرتا ہے، جس میں طفیلی کے انڈے ہیں۔
2 — انڈا **میٹھے پانی** سے ملے بغیر نہیں پھوٹتا، اور اُس سے تیرتا ہوا لاروا نکلتا ہے۔
3 — لاروا **میٹھے پانی کے گھونگے** میں داخل ہوتا ہے — اور یہ گھونگے ٹھہرے یا سست پانی کے سوا زندہ نہیں رہتے — اور اُس کے اندر ہزاروں گنا بڑھتا ہے۔
4 — اُس سے دوسرے لاروے نکلتے ہیں جو پانی میں تیرتے ہیں، پھر اگر کوئی انسان اُس میں اُترے تو وہ **چند منٹوں میں اُس کی کھال چیر دیتے ہیں**۔

اور **لائپر** نے سن **1915** میں وہ حصہ ثابت کیا جس کی کسی کو توقع نہ تھی: یہ کہ بیماری **منہ کے راستے سرے سے لگتی ہی نہیں**، بلکہ کھال چیرنے سے لگتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ یہ ممانعت **مرکب آئی، اکہری نہیں**۔ یہ نہیں فرمایا: پانی میں پیشاب نہ کیا جائے۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا: ٹھہرے پانی میں غسل نہ کیا جائے۔ بلکہ دونوں کاموں کو ایک ہی جملے میں «پھر» کے ساتھ جوڑ دیا: **اُس میں پیشاب کرنا، پھر اُسی میں غسل کرنا**۔ اور یہی دونوں — حرف بہ حرف — اُس چکر کا دروازہ اور اُس کا نکاس ہیں۔

پھر اُس قید کو دیکھیے: **«ٹھہرا ہوا پانی جو بہتا نہیں»**۔ ایسی قید جس کا کوئی مطلب نہ ہوتا اگر ممانعت محض گھن کی وجہ سے ہوتی، کہ گندگی بہتے پانی میں بھی گندگی ہے۔ مگر یہ نہایت باریک ہے اگر مراد وہی ہو جو ہم آج جانتے ہیں: **بیماری اُٹھانے والا گھونگا بہتے پانی میں زندہ نہیں رہتا**۔

اور اگر معاملہ ذوق اور گھن کا ہوتا تو زیادہ مناسب یہ تھا کہ اُس میں سے **پینے** سے منع کیا جاتا — کہ یہ طبیعت کے زیادہ قریب ہے اور پہلی بات ہے جو ذہن میں آتی ہے۔ مگر ممانعت **غسل** پر آئی، اور کوئی یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ پینے سے زیادہ خطرناک ہے... یہاں تک کہ لائپر نے 1915 میں ثابت کیا کہ بیماری **کھال سے لگتی ہے، منہ سے نہیں**۔

ایک ہی جملے میں تین قیدیں — **ٹھہراؤ، پیشاب، اور غسل** — اِن میں سے ہر ایک ایسی بیماری کے چکر کے ایک حقیقی جوڑ کو نشانہ بناتی ہے جس کا پہلا کیڑا بارہ صدیوں کے بعد دیکھا گیا، اور جس کے پھیلنے کا راستہ تیرہ صدیوں کے بعد معلوم ہوا۔ **تو اُنہیں اِن تینوں کا پتا کس نے دیا؟**

مآخذ Theodor Bilharz — Kasr el-Aini, Cairo, 1851 · Leiper (1915) — the Bilharzia Mission in Egypt · WHO — fact sheet: *Schistosomiasis*

یہ دوا نہیں... بلکہ خود بیماری ہے

> یہ دوا نہیں، بلکہ بیماری ہے
>
> مسلم کی روایت — صحیح

ایک جملہ: پچیس صدیوں کا اجماع، اور اُس کا ٹوٹنا

پچیس صدیاں: دوا

2100 ق م — دستورِ سومر

بقراط: ہر پرہیزی نظام میں

جالینوس: صاف اور متوازن کرتی ہے

→

اور طب جہاں تک پہنچی

1916ء — دستورِ ادویہ سے خارج

1917ء — کوئی علمی قدر نہیں

2023ء — کوئی مقدار محفوظ نہیں

دوا نہیں... بلکہ بیماری ہے

کہی گئی جب وہ ساری دنیا کی دوا تھی

اُس سے کہی جس نے کہا: میں اسے دوا ہی کے لیے بناتا ہوں

یہ نہیں فرمایا کہ اُس کا نقصان نفع سے زیادہ ہے — بلکہ دوا ہونے کی نفی کی اور بیماری ہونا ثابت کیا

آسان لفظوں میں

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس شراب کے بارے میں پوچھنے آیا، تو آپ نے منع فرمایا۔ اُس شخص نے کہا: **«میں تو اسے صرف دوا کے لیے بناتا ہوں»**۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «یہ دوا نہیں، بلکہ بیماری ہے»۔ اور اُس دن شراب بلا شرکتِ غیرے **ساری دنیا کی دوا** تھی۔ اور آج عالمی ادارۂ صحت اُسے **پہلے درجے کی سرطان پیدا کرنے والی چیز** شمار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ **اُس کی کوئی مقدار سرے سے محفوظ نہیں**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم طب میں شراب کوئی ایسا مشروب نہ تھی جسے ہلکا لیا جاتا — بلکہ وہ **علاج کے ستونوں میں سے ایک ستون** تھی۔ تاریخ کا قدیم ترین دستورِ ادویہ، سومر سے تقریباً **2100 قبل مسیح**، شراب کو دوا لکھتا ہے۔ اور مصری **ایبرس** پیپرس، تقریباً 1550 قبل مسیح، اُسے جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملاتا ہے، جراثیم کش بھی اور دوا کا حامل بھی۔ اور **بقراط** نے اُسے تقریباً ہر بیماری کے پرہیزی نظام میں داخل کیا اور زخموں کا مطہر بنایا۔ اور **جالینوس** نے کہا کہ وہ بدن کو صاف کرتی ہے اور اُس کے اخلاط میں توازن لاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ طب کی کتابوں میں **تقریباً پچیس صدیوں** تک چلتا رہا، انیسویں صدی تک۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تبدیلی کا آغاز 1850 کے بعد تجرباتی طب کے ساتھ ہوا۔ سن **1916** میں وہسکی اور برانڈی **امریکی دستورِ ادویہ** سے نکال دی گئیں۔ اور **1917** میں امریکی طبی انجمن نے اعلان کیا کہ الکحل بطور مقوی یا محرک **«کوئی علمی قدر نہیں رکھتی»**۔

پھر آخری فیصلہ آیا: سرطان کی تحقیق کا بین الاقوامی ادارہ الکحل کو **پہلے درجے** میں رکھتا ہے — سرطان پیدا کرنے والی چیزوں کا سب سے اونچا درجہ، ایسبسٹس، تابکاری اور تمباکو کے ساتھ۔ اور **جنوری 2023** میں عالمی ادارۂ صحت نے شائع کیا کہ **الکحل کی کوئی مقدار صحت کے لیے محفوظ نہیں**۔ اور کم از کم **سات قسم کے سرطان** اُس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، اور ہر سال تقریباً **7 لاکھ 40 ہزار نئے مریض**۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اِس بات کے موقع پر ٹھہریے۔ وہ شخص لذت کے لیے پینے کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا، نہ خواہش کا عذر پیش کر رہا تھا — اُس نے کہا: **«میں تو اسے صرف دوا کے لیے بناتا ہوں»**۔ یعنی وہ اُس دن ساری دنیا میں سب سے مضبوط دلیل لے کر آیا تھا۔ اور اگر یہ ممانعت محض تعبدی ہوتی تو جواب یہ ہوتا: «اسے نہ پیجیے، دوا کے لیے بھی نہیں»۔ مگر جواب **اُس کی حقیقت کی خبر** بن کر آیا: یہ دوا ہے ہی نہیں — بلکہ یہی بیماری ہے۔

اور یہ ایسا جملہ ہے جو اُس دن روئے زمین پر موجود ہر طب کے اجماع کے خلاف ہے: یونانی، رومی، فارسی، ہندی اور مصری۔ **ایک مکتب بھی اِس سے متفق نہیں** — سو کوئی ایسا تھا ہی نہیں جس سے یہ بات لی جا سکتی، کیونکہ یہ ایسی بات تھی جس کا کوئی کہنے والا نہ تھا۔

پھر وقت گزرا۔ شراب 1916 میں دساتیرِ ادویہ سے نکل گئی، اور 2023 میں پہلے درجے کی سرطان پیدا کرنے والی چیز بن گئی جس کی کوئی مقدار محفوظ نہیں۔ یعنی طب کو **تیرہ صدیاں** درکار ہوئیں تاکہ وہاں پہنچے جو پانچ لفظوں کے ایک جملے نے کہہ دیا تھا۔

اور اِس اندازِ بیان کی باریکی دیکھیے: یہ نہیں فرمایا کہ «اُس کا نقصان اُس کے نفع سے زیادہ ہے» — جو بات محتاط آدمی کہتا ہے اور اِس میں محفوظ رہتا ہے — بلکہ **اُس سے دوا ہونے کی صاف نفی کی اور بیماری ہونا صاف ثابت کیا**۔ اور یہی وہ بات ہے جہاں ادارہ تیرہ صدیوں بعد پہنچا: **کوئی مقدار محفوظ نہیں۔ تو اُنہیں کس نے بتایا؟**

ماخذ U.S. Pharmacopeia — alcohol removed, 1916 · WHO, 4 Jan 2023 — *No level of alcohol consumption is safe* · IARC Monographs 100E — alcohol, Group 1

قرنطینہ... طب سے ایک ہزار برس پہلے

جب کسی سرزمین میں طاعون کی خبر سنیں تو وہاں نہ جائیں، اور جب وہ اُس سرزمین میں پھوٹ پڑے جہاں آپ ہوں تو اس سے بھاگتے ہوئے نہ نکلیں

بخاری اور مسلم نے روایت کیا — متفق علیہ

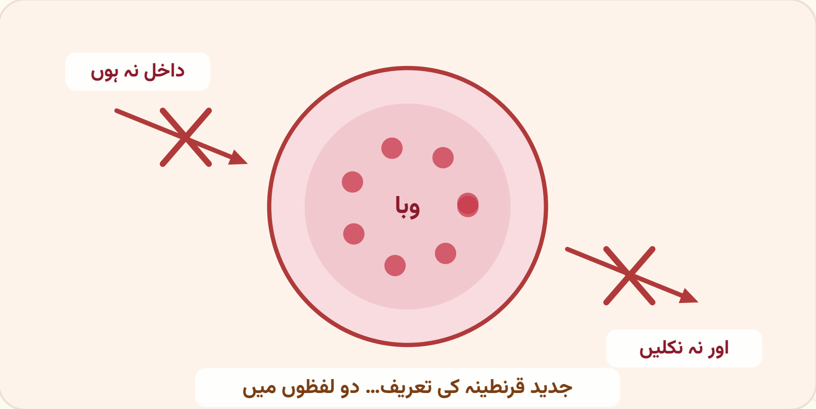

ایک عالمی صحتی اصول جو ساتویں صدی عیسوی میں وضع کیا گیا

آسان لفظوں میں

اگر کسی ملک میں وبا پھوٹ پڑے: اگر آپ باہر ہیں تو **اس میں داخل نہ ہوں**، اور اگر آپ اندر ہیں تو **اس سے باہر نہ نکلیں**۔ اور یہ بعینہٖ **قرنطینہ** کی وہی تعریف ہے جو ساری دنیا نے کورونا کی وبا میں برتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

وباؤں کو غضب، یا بدروحیں، یا بگڑی ہوئی ہوا سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کے پھوٹ پڑنے پر فطری ردِّعمل **اجتماعی فرار** تھا — اور یہی سب سے بدترین کام ہے، کیونکہ یہ وبا کو ہر جگہ لے جاتا ہے۔ اور جراثیم معلوم نہ تھے، اور نہ یہ معلوم تھا کہ بیماری میل جول سے منتقل ہوتی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جرثومی نظریہ انیسویں صدی ہی میں پاستور اور کوخ کے ہاتھوں قائم ہوا۔ اور یورپ میں پہلا منظم قرنطینہ راگوزا (ڈوبروونک) میں 1377ء میں ہوا، پھر وینس نے پہلا مستقل قرنطینہ گھر 1423ء میں بنایا — یعنی اس حدیث کے سات صدیاں بعد۔ اور حدیث میں مذکور اصول ایک **دو طرفہ قرنطینہ** ہے: داخلے کی ممانعت اور نکلنے کی ممانعت — اور بعینہٖ یہی وہ ہے جو عالمی ادارۂ صحت کے بین الاقوامی صحتی ضوابط میں درج ہے، اور جو 2020ء میں ساری دنیا میں برتا گیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حدیث کا دوسرا نصف ہی سب سے مشکل اور سب سے باریک ہے۔ وبا زدہ سرزمین میں داخلے کی ممانعت تو ایسی بات ہے جس تک محض احتیاط سے عقل پہنچ سکتی ہے۔ رہی **اس سے نکلنے کی ممانعت**، تو یہ خود بقا کی جبلت کے خلاف ہے، اور تب ہی ٹھیک بیٹھتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ نکلنے والا بیماری اپنے ساتھ لے جا سکتا ہے **اور اسے خبر تک نہ ہو** — یعنی «**وبا کے خاموش حامل**» کا تصور۔ اور یہ ایسا تصور ہے جو بیسویں صدی ہی میں معلوم ہوا۔ اور اسے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے **طاعونِ عَمَواس** میں عملاً برتا اور لشکر کو شام سے واپس لے آئے، پھر جب ان پر عتاب کیا گیا تو فرمایا: «ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں»۔

مآخذ WHO — *International Health Regulations* (2005) · Quarantine — Ragusa and Venice, 1377

11 روم مغلوب ہو گیا... اور وہ ضرور غالب آئے گا

> الم ۝ روم مغلوب ہو گیا ۝ زمین کے سب سے نشیبی حصے میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد ضرور غالب آئیں گے ۝ چند برسوں میں
>
> سورہ روم — آیات 1-4

ایک خبر جو مکہ میں ایسی جنگ پر اُتری جو ہزاروں میل دور لڑی جا رہی تھی

آسان لفظوں میں

روم ایک جنگ اِتنی بُری طرح ہارا کہ لوگوں نے سمجھ لیا وہ ختم ہو گیا۔ پھر ایک آیت اُتری جو کہتی ہے: **روم چند برسوں میں غالب آ جائے گا**۔ اور یہ سات برس بعد واقع ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سن 614 عیسوی میں فارسیوں نے رومیوں کو بُری طرح کچل دیا: شام اور بیت المقدس لے لیا، پھر 618 اور 621 کے درمیان مصر، اور مقدس صلیب اُٹھا لے گئے۔ اور رومی سلطنت مکمل تباہی کے کنارے تھی — خالی خزانہ، ٹوٹی ہوئی فوج اور اندرونی بغاوت۔ اور زمین پر کوئی اُس کی واپسی پر شرط نہ لگاتا تھا۔ اور مکہ کے مشرکوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اِس آیت کے جھوٹا ہونے پر شرط لگائی — اور شرط لگانا اُس کی حرمت سے پہلے جائز تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سن 622 میں ہرقل جوابی مہم پر نکلا اور اُسی سال خزاں میں شہربراز کو شکست دی، پھر کسریٰ کے لشکر کو **624 میں گنزک** کو توڑا — اور یہی بدر کا سال ہے، جیسا کہ اگلی آیت نے کہا: «اور اُس دن مومن خوش ہوں گے»۔ اور **دسمبر 627** میں اُس نے موصل کے قریب نینویٰ کی جنگ میں فارسی لشکر کو کچل دیا، پھر 628 میں کسریٰ کو گرا دیا اور صلیب واپس لایا۔ اور یہ بازنطینی، فارسی اور سریانی مصادر میں ثابت ہے، اسلامی مصادر سے آزادانہ طور پر۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ نہ کوئی حکمت ہے نہ کوئی وصف — یہ **ایک ایسی پیشین گوئی ہے جس کا موضوع بھی متعیّن ہے اور مدت بھی**، اور یہ اُس فریق کے حق میں اُس وقت آئی جو اُس کے لیے بدترین ممکن لمحہ تھا۔ اور عربی میں «بِضع» تین اور نو کے درمیان محدود ہے — یعنی ایک بند مدت جسے جھٹلایا جا سکتا تھا۔ اور اگر دس برس بغیر فتح کے گزر جاتے تو یہ پوری دعوت اپنے مخالفوں کے سامنے گر جاتی۔ اور اِس سے بھی باریک بات: «**زمین کے سب سے نشیبی حصے میں**» — اور یہ جنگ بحیرۂ مردار کے علاقے میں ہوئی، جو **کرۂ ارض کی خشکی کا سب سے نیچا مقام** ہے (سطحِ سمندر سے 430 میٹر نیچے) — ایک جغرافیائی حقیقت جو انیسویں صدی سے پہلے ناپی ہی نہیں گئی تھی۔

ماخذ Battle of Nineveh, 627 CE · Kaegi — *Heraclius: Emperor of Byzantium*

«سب سے نیچی زمین میں»... کرۂ ارض کی پست ترین خشکی

الم ۝ رومی مغلوب ہو گئے ۝ سب سے نیچی زمین میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آئیں گے

سورہ روم — آیات 1-3

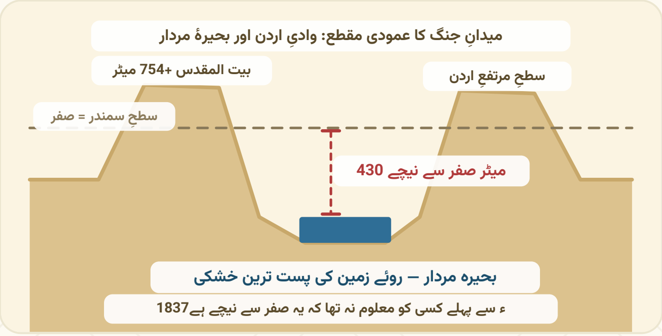

کرۂ ارض پر وہ واحد زمین جس پر یہ لفظ دونوں معنوں میں صادق آتا ہے

آسان لفظوں میں

آیت نے صرف اتنا نہیں کہا کہ «رومی مغلوب ہو گئے» — بلکہ جگہ بھی متعین کی: **«سب سے نیچی زمین میں»**۔ اور عربی میں لفظ «ادنیٰ» دو معنی رکھتا ہے: **سب سے قریب**، اور **سب سے نیچا**۔ اور لڑائی ایک ایسے علاقے میں ہوئی جو واقعی **پورے روئے زمین کی سب سے نیچی خشکی** ہے — بحیرہ مردار کے گرد وادیِ اردن۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ساتویں صدی میں کسی کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ کوئی جگہ سطحِ سمندر سے کتنی بلند ہے۔ آنکھ یہ نہیں دکھاتی، اور جو مسافر اس وادی میں اترتا ہے وہ ایک نیچی وادی دیکھتا ہے، ویسی ہی جیسی وہ یمن، عمان اور فارس میں دیکھ چکا ہے۔

اور **سطحِ سمندر سے بلندی کی پیمائش ایک ایسا علم تھا جو ابھی پیدا ہی نہ ہوا تھا**: اس کے لیے بیرومیٹر چاہیے (جو 1643ء سے پہلے ایجاد ہی نہیں ہوا) یا ساحل سے چلتی ہوئی لمبی مثلثی پیمائش۔ اور کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی خشکی سمندر کی سطح سے **نیچے** ہو سکتی ہے اور پانی اسے ڈبوتا نہ ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مارچ 1837ء میں دو سیاحوں **مور اور بیکی** نے پانی کے نقطۂ جوش کے طریقے سے اس علاقے کی پیمائش کی کوشش کی، تو ایسا نتیجہ نکلا جس نے جغرافیہ دانوں کو چونکا دیا: یہ جگہ سمندر کی سطح سے **نیچے** ہے۔ پھر لیفٹیننٹ **سیمنڈز** نے 1841ء میں اسے مثلثی پیمائش سے ناپا، پھر **لنچ** کی امریکی مہم نے 1848ء میں۔

اور آج کا عدد: بحیرہ مردار کی سطح تقریباً **430 میٹر سطحِ سمندر سے نیچے** ہے، اور یہ **پوری سطحِ زمین کا پست ترین کھلا مقام** ہے — کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرتا۔ اور یہ صدعِ بحیرہ مردار کا حصہ ہے، جو عظیم افریقی شگاف کے اندر پھیلا ہوا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ آیت جگہ کا ذکر کرنے پر مجبور ہی نہ تھی۔ فتح کی پیش گوئی اس کے بغیر بھی پوری ہو جاتی ہے۔ سو ایک زائد جغرافیائی قید کا داخل کرنا **جھٹلائے جانے کے مواقع میں اضافہ** ہے، تصدیق کے مواقع میں نہیں — اور جو کوئی متن گھڑتا ہے وہ اس کے بالکل الٹ کرتا ہے۔

پھر یہ کہ لفظ کا پہلا معنیٰ — «جزیرۂ عرب سے سب سے قریب» — درست بھی ہے اور تنہا کافی بھی، اور متن میں کوئی چیز دوسرے معنیٰ پر موقوف نہیں۔ لیکن دوسرا معنیٰ بھی درست ہے، **اور ایسے انداز میں کہ کرۂ ارض کی کوئی اور جگہ اس میں شریک نہیں**۔ دونوں دلالتوں کا ایک ہی مقام پر جمع ہو جانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پہلے سے حساب لگایا جاتا ہو۔

اور یہاں ایک حد بیان کر دینی چاہیے: پہلے مفسرین نے اسے قرب پر محمول کیا، پستی پر نہیں، کیونکہ پستی ان کے علم میں تھی ہی نہیں — اور یہی خود گواہی ہے: **معنیٰ متن میں اس سے پہلے موجود تھا کہ لوگوں کے پاس اسے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا**۔ اور خود پیش گوئی — چند برسوں میں فتح — اپنے پیروں پر الگ قائم رہتی ہے، اور وہ اس کتاب کے ایک دوسرے صفحے پر ہے۔

ماخذ The Dead Sea — the lowest land on earth · Moore & Beke (1837) — the first measurement of the depression · Lt. John Symonds — the 1841 trigonometric survey · NASA Earth Observatory — the Dead Sea

ایک جھوٹا، خطاکار ناصیہ

هرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور ناصیہ پکڑ کر گھسیٹیں گے ۝ ایسا ناصیہ جو جھوٹا ہے، خطاکار ہے

سورہ العلق – آیات 15–16

فعلی تصویرکشی جھوٹ کے لمحے پیشانی کے پچھلے قشر کی سرگرمی دکھاتی ہے

آسان لفظوں میں

«ناصیہ» سر کا اگلا حصہ ہے، پیشانی کی طرف سے۔ اور قرآن نے اُسے «جھوٹا اور خطاکار» کہا – یعنی **جھوٹ اور خطا اِسی مقام سے سرزد ہوتے ہیں**۔ اور یہی ہے جو علمِ اعصاب نے ثابت کیا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سر کے کسی متعین حصے اور جھوٹ جیسے اخلاقی عمل کے درمیان کوئی رشتہ معلوم نہ تھا۔ فلسفی تو بنیادی بات میں بھی اختلاف رکھتے تھے: ارسطو نے سوچ کا مرکز **دل** میں رکھا تھا، دماغ میں نہیں۔ اور دماغ کے خطوں کے کاموں کا نقشہ اُنیسویں صدی سے پہلے بننا شروع ہی نہ ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

قشرِ پیش پیشانی (Prefrontal Cortex) – جو ٹھیک پیشانی کے پیچھے واقع ہے – فیصلہ سازی، منصوبہ بندی اور رویّے کو روکنے کا مرکز ہے۔ اور فعلی مقناطیسی تصویرکشی کی تحقیقات دکھاتی ہیں کہ **ارادی جھوٹ خاص اِسی خطے کو سرگرم کرتا ہے**، کیونکہ اُس میں سچ کو دبانا اور اُس کی جگہ کوئی متبادل گھڑنا پڑتا ہے۔ اور اِس خطے کو نقصان پہنچے تو انسان اپنے رویّے پر قابو کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے – جیسا کہ 1848 میں فینیاس گیج کے مشہور واقعے میں ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اِس نسبت کی باریکی پر غور کیجیے۔ آیت نے یہ نہیں کہا: «کسی جھوٹے، خطاکار کا ناصیہ» – یعنی اُس کے مالک کا – بلکہ **خود ناصیے** کو جھوٹا اور خطاکار کہا، اور فعل کو شخص کے بجائے عضو سے منسوب کیا۔ اور یہ کسی کام کے مقام کا تشریحی تعین ہے۔ اور اِس سے بھی زیادہ چونکا دینے والی بات: جس شخص کو آیت نے نشانہ بنایا تھا، اُسے اُس کی سب سے قیمتی چیز میں دھمکی دی جا رہی تھی – اور نہ اُس کے دل کا نام لیا گیا نہ زبان کا، بلکہ اُس کے سر کے اگلے حصے کا: دماغ میں فیصلے اور جھوٹ کی جگہ۔

مآخذ Kandel et al. – *Principles of Neural Science* · Harlow – the case of Phineas Gage

14

کارکن مکھیاں... سب کی سب مادہ

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا ۞ پھر ہر طرح کے پھلوں سے کھا اور اپنے رب کے راستوں پر فرمانبرداری سے چل

سورہ النحل – آیات 68–69

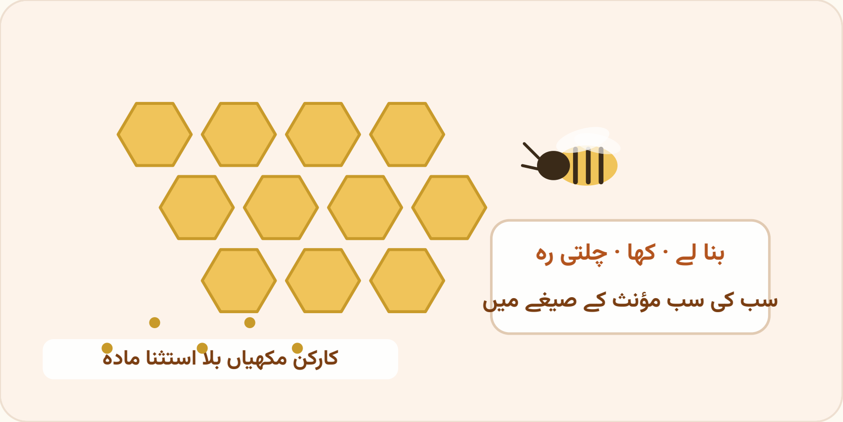

ہر مکھی جو آپ کو رس جمع کرتی اور موم بناتی دکھائی دے، مادہ ہے

آسان لفظوں میں

اِن آیتوں میں اللہ نے مکھی کو جتنے بھی حکم دیے، سب **مؤنث کے صیغے** میں ہیں: «اتَّخِذِی، کُلِی، اسلُکِی»۔ اور علم کہتا ہے: جو مکھیاں بناتی ہیں، جمع کرتی ہیں اور شہد بناتی ہیں، وہ **سب کی سب مادہ** ہیں، اُن میں ایک بھی نر نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم دنیا میں عام خیال یہ تھا کہ چھتے کا سربراہ ایک **نر بادشاہ** ہے — ارسطو نے صراحتاً یہی کہا اور اُسے «بادشاہ» کا نام دیا، اور یورپ والے صدیوں اُس کے پیچھے چلتے رہے اور اُسے King Bee کہتے رہے۔ اور 1668 تک، ولندیزی عالم یان سوامردام کے ہاتھوں، یہ ثابت ہی نہ ہوا کہ چھتے کا سربراہ مادہ ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شہد کی مکھیوں کے چھتے میں تین طبقے ہوتے ہیں: ایک **مادہ ملکہ**، ہزاروں **مادہ کارکن** جو موم بناتی ہیں، رس جمع کرتی ہیں، شہد بناتی ہیں، پہرہ دیتی ہیں اور صفائی کرتی ہیں، اور چند سو **نر** جن کا ملکہ سے جفتی کے سوا کوئی کام نہیں، اور اِس کے بعد وہ مر جاتے ہیں یا نکال دیے جاتے ہیں۔ نر نہ چرنے نکلتا ہے، نہ کچھ بناتا ہے، اور نہ شہد بنانے میں اُس کا سرے سے کوئی حصہ ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

پے در پے تین فعلوں میں مؤنث کے صیغے کی مکمل پابندی، ایسی زبان میں جہاں دونوں جنس جمع ہوں تو مذکر کو غالب کیا جاتا ہے، کوئی نحوی اتفاق نہیں۔ بلکہ یہ تخصیص اور باریک ہو جاتی ہے: یہ تینوں فعل ٹھیک وہی کام ہیں جو **مادہ کارکن** کے ہیں — گھر بنانا، پھلوں پر چرنا، اور راستوں پر آنا جانا۔ اگر پوری نوع مراد ہوتی تو جمع مذکر کا صیغہ آتا۔ اور یہ اُس کے خلاف ہے جو اُس زمانے کے سب سے بڑے عالم مانتے تھے۔

مآخذ Aristotle — *Historia Animalium* · Jan Swammerdam — the ruler of the hive is female

15

سماعت بصارت سے پہلے... ہر بار

> اور اُس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تاکہ تم شکر کرو
>
> سورہ النحل – آیت 78

آنکھ کام کرتی ہے

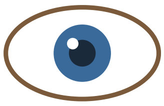

ہفتہ 28

کان کام کرتا ہے

ہفتہ 24

سماعت بصارت سے چار ہفتے پہلے مکمل ہوتی ہے

پورے قرآن میں، انسان کی تخلیق کے سیاق میں، بصارت ایک بار بھی سماعت سے آگے نہیں آئی

آسان لفظوں میں

انسان کی تخلیق اور اُس کے آلاتِ ادراک کے ذکر کے سیاق میں، قرآن میں بصارت **ایک بار بھی** سماعت سے آگے نہیں بڑھی۔ اور علم کہتا ہے: جنین کا کان اُس کی آنکھوں سے مہینوں پہلے کام کرنے اور سننے لگتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

آنکھ وہی حس ہے جسے ہر انسان فطرتاً آگے رکھتا ہے: «میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا» «میں نے سنا» سے زیادہ مضبوط ہے، اور چشم دید گواہی خبر سے اوپر بیٹھتی ہے۔ اور ہر زبان میں فطری ترتیب بصارت سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ جنین سنتا بھی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

کان کا حلزون تقریباً بیسویں ہفتے میں اپنی ساخت مکمل کرتا ہے، اور جنین **چوبیسویں ہفتے** سے آوازوں کا ثابت شدہ جواب دیتا ہے۔ جبکہ پردۂ چشم اور بصری راستہ **اٹھائیسویں ہفتے** سے پہلے کارکردگی کے اعتبار سے مکمل نہیں ہوتے۔ اور نومولود پیدائش کے پہلے ہی لمحے اپنی ماں کی آواز پہچان لیتا ہے، جبکہ صاف دیکھنے میں اُسے مہینوں لگ جاتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز کسی ایک جگہ میں نہیں، بلکہ **مکمل اطراد** میں ہے۔ اگر یہ ترتیب اتفاقی ہوتی تو تیرہ مقامات میں کم از کم ایک بار بدل جاتی۔ اور باوجود اِس کے کہ یہ زبان کے عام ذوق کے خلاف ہے، بلااستثنا قائم ہے۔ بلکہ باریکی اور بڑھ جاتی ہے: اِن مقامات پر «السَّمع» **واحد** آیا ہے اور «الأبصار» **جمع** – کیونکہ سماعت ایک ہی حس ہے جو ہر طرف سے ایک ہی قسم کا ادراک وصول کرتی ہے، جبکہ دو آنکھیں دو مختلف عکس بناتی ہیں جو دماغ میں جوڑ دیے جاتے ہیں۔

مآخذ [Britannica – “Prenatal development](#) · [Moore & Persaud – *The Developing Human*”](#)

16 درد جلد میں بستا ہے

جب بھی اُن کی کھالیں پک جائیں گی، ہم اُن کی جگہ دوسری کھالیں بدل دیں گے تا کہ وہ عذاب چکھیں

سورہ النساء — آیت 56

سطح کے قریب گھنے آزاد عصبی سرے

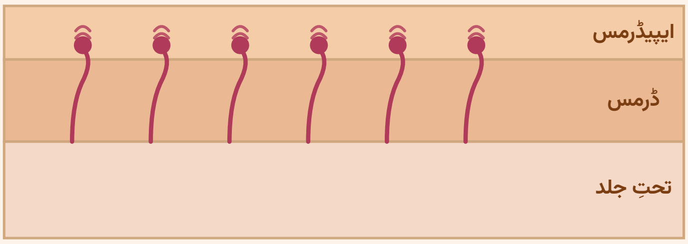

درد کے سب وصول کنندے جلد میں ہیں — جلد جل جائے تو احساس ختم

تیسرے درجے کا گہرا جلنا درد نہیں دیتا — کیونکہ درد کے وصول کنندے خود جل چکے ہوتے ہیں

آسان لفظوں میں

درد کے وصول کنندے پورے بدن میں پھیلے ہوئے ہیں، مگر سب سے گھنے وہ **جلد** میں ہیں، اور اِس اعتبار سے جسم کا سب سے بھرپور عضو جلد ہی ہے۔ اِسی لیے جب جلد گہرائی تک جل جاتی ہے تو اُس جگہ درد کا احساس رک جاتا ہے۔ اور آیت جلد بدل دیتی ہے تاکہ احساس جاری رہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

درد کو پورے بدن کا ایک عام احساس سمجھا جاتا تھا، یا دل کا، یا روح کا۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اُس کے **خاص عصبی وصول کنندے** ہیں، اور نہ یہ کہ اُن کا کوئی متعین مقام ہے۔ اور درد کے وصول کنندوں کا علمی بیان 1906 میں چارلس شیرنگٹن کے ہاتھوں ہی ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

درد کے وصول کنندے (Nociceptors) آزاد عصبی سرے ہیں جو **جلد کی تہوں** میں مرتکز ہیں۔ اور تیسرے درجے کے جلنے میں، جہاں جلد اپنی پوری موٹائی سمیت تباہ ہو جاتی ہے، **مریض جلی ہوئی جگہ پر درد کا احساس بالکل کھو دیتا ہے** — اور یہ ایک تسلیم شدہ تشخیصی علامت ہے جسے ڈاکٹر جلنے کے درجوں میں فرق کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اور علاج کے لیے جلد کی پیوندکاری درکار ہے، تاکہ احساس لوٹ آئے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

علت خود آیت میں بیان ہو چکی ہے: «**تاکہ وہ عذاب چکھیں**»۔ یعنی جلد کا بدلنا سزا میں اضافہ نہیں، بلکہ **اُس کے احساس کے جاری رہنے کی شرط** ہے۔ اور یہ دو باتوں کا ایک ساتھ جاننا چاہتا ہے: یہ کہ درد کے احساس کی جگہ ہر چیز سے پہلے جلد ہے، اور یہ کہ جلد پک جائے، یعنی پوری جل جائے، تو **احساس ختم ہو جاتا ہے**۔ سو آیت نے صرف درد کو بیان نہیں کیا، بلکہ اُس پر ایک منطقی حکم کھڑا کیا جو اِس طبی حقیقت کے بغیر درست ہی نہیں بیٹھتا۔

مآخذ Sherrington — *The Integrative Action of the Nervous System*, 1906 · Kandel et al. — *Principles of Neural Science*

ہضم شدہ غذا اور خون کے بیچ سے خالص دودھ

> اور بے شک تمہارے لیے چوپایوں میں ایک عبرت ہے: ہم تمہیں اُن کے پیٹوں کے اندر سے، ہضم شدہ غذا اور خون کے بیچ سے، خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے
>
> سورہ النحل — آیت 66

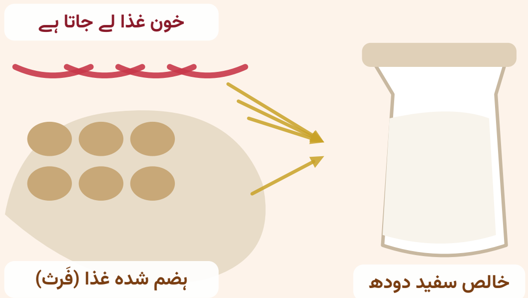

غدود خون سے اپنی ضرورت چُنتا ہے، اور دونوں میں سے کچھ دودھ تک نہیں پہنچتا

دودھ تھن میں اُن مادوں سے بنتا ہے جو خون آنتوں سے اٹھا کر لاتا ہے

آسان لفظوں میں

وہ سفید خالص دودھ جو آپ پیتے ہیں، گائے کے جسم میں ایسی جگہ بنتا ہے جو آنتوں میں موجود ہضم شدہ غذا اور رگوں میں دوڑتے خون کے **بیچ** ہے۔ اور اِس کے باوجود وہ **خالص** نکلتا ہے، نہ اِس کا رنگ لیے ہوئے نہ اُس کا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دودھ کے بننے کا طریقہ سرے سے معلوم نہ تھا۔ گمان یہ تھا کہ دودھ تھن میں اُسی طرح جمع ہوتا ہے جیسے مشک میں پانی۔ رہا اُسے ہضم شدہ غذا اور خون دونوں سے جوڑنا، اور اُس کی جگہ **اُن دونوں کے بیچ** ٹھہرانا، تو اِس کا کسی کو کوئی علم نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

غذا آنتوں میں ہضم ہوتی ہے، پھر اُس کے اجزا خون میں جذب ہو جاتے ہیں۔ خون اُنھیں تھن کے اندر دودھ کے غدود تک لے جاتا ہے، اور وہاں کے پوششی خلیے خون میں سے اپنی ضرورت کی شکر، امینو تیزاب، چکنائی اور نمکیات چن لیتے ہیں، پھر **دودھ کو نئے سرے سے ترکیب دیتے ہیں** اور خارج کرتے ہیں۔ سو دودھ نہ چھنا ہوا خون ہے نہ گھلی ہوئی غذا، بلکہ ایک بنایا ہوا مادہ ہے جس کے بننے کی جگہ نظامِ ہضم اور دورانِ خون کے درمیان ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حرفِ جر «**مِن بَين**» ہی وہ جگہ ہے جہاں اعجاز بیٹھا ہے۔ آیت نے «ہضم شدہ غذا اور خون سے» نہیں کہا — کہ پھر دودھ اُن دونوں سے نکالا ہوا اور اُن میں ملا ہوا ہوتا؛ اور نہ «ہضم شدہ غذا اور خون کے بعد» کہا۔ بلکہ کہا «اُن دونوں کے بیچ سے» — یعنی بننے کی جگہ **اِس سلسلے میں اُن دونوں کے درمیان پڑتی ہے**: ہضم کے بعد اور خون کے اُنہیں پہنچا دینے کے بعد، اور دودھ کے نکلنے سے پہلے۔ پھر نتیجے کو «**خالص**» کہا — یعنی اُس کے نشان سے بالکل خالی جس سے وہ آیا ہے۔ یہ ایک ایسے فعلی راستے کا بیان ہے جو 1628 میں دورانِ خون کی دریافت سے پہلے سمجھا ہی نہ گیا تھا۔

مآخذ Harvey — *De Motu Cordis*, 1628 · Guyton & Hall — *Textbook of Medical Physiology*

18

ہاتھ دھوئیے، جاننے سے پہلے کہ کیوں

جب آپ میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو اپنا ہاتھ برتن میں نہ ڈالے جب تک اسے تین بار نہ دھو لے،
کیونکہ اسے معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری

بخاری اور مسلم نے روایت کیا — متفق علیہ

اسے معلوم نہیں کہ رات اس کا ہاتھ کہاں رہا» — اَن دیکھے پر قائم علت»

4	3	2	1
منہ دھونا	مسواک	ہاتھ دھونا	پانچ بار وضو
اور ناک اور چہرہ	ہر نماز پر	بیداری پر	دن میں

ہاتھ دھونا طب کا سب سے اہم اکیلا احتیاطی اقدام
عالمی ادارۂ صحت

طہارت کا ایک روزانہ نظام جو ہر مسلمان پر دن میں پانچ بار لازم ہے

آسان لفظوں میں

نبی ﷺ نے بیدار ہونے پر کھانے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا حکم دیا، اور اس کی ایک عجیب علّت بیان فرمائی: **«اسے معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری»** — یعنی ایک ایسا ممکنہ اذیت رساں ہے جو **آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جراثیم کسی بھی صورت میں معلوم نہ تھے۔ اور صفائی **ظاہر اور بو** کا معاملہ تھی: اگر ہاتھ آنکھ میں صاف ہے تو وہ صاف ہے۔ اور کسی چھپے ہوئے تعدیے کا کوئی تصور ہی نہ تھا جو چھونے سے منتقل ہوتا ہو۔ بلکہ یورپ میں اطبا انیسویں صدی تک مُردوں کی تشریح سے اٹھ کر عورتوں کی زچگی کرانے چلے جاتے تھے، بغیر ہاتھ دھوئے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ہاتھ دھونا آج عالمی ادارۂ صحت کے اقرار کے مطابق **ساری طب کا سب سے اہم اکیلا احتیاطی اقدام** ہے، اور اکیلا یہی ہر سال لاکھوں بیماریوں کو روکتا ہے۔ اور یہ 1847ء میں ہنگری کے طبیب **سیملوائس** کے ہاتھوں دریافت ہوا، جس نے دیکھا کہ اطبا کے ہاتھ دھونے سے زچہ عورتوں کی اموات 18% سے گھٹ کر 2% رہ گئیں — **تو اس کے ساتھیوں نے اس کا مذاق اڑایا، اسے نوکری سے نکال دیا گیا اور وہ ایک پاگل خانے میں مرا**۔ رہا مسلمان، تو وہ اپنے ہاتھ، چہرہ، منہ، ناک، بازو اور پاؤں دن میں پانچ بار دھوتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دلالت کا مقام **علّت بیان کرنے** میں ہے، حکم میں نہیں۔ صفائی کے حکم کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ ذوق ہے یا عادت۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ **«اسے معلوم نہیں کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری»**، تو یہ ایک ایسی چیز سے علّت بیان کرنا ہے جو **نامعلوم اور غیر مرئی** ہے — یعنی خطرہ موجود ہے خواہ ہاتھ صاف ہی دکھائی دے۔ اور یہی اُس چھپے ہوئے تعدیے کے تصور کا جوہر ہے جس پر سارا احتیاطی طب کھڑا ہے۔ اور اس کے ساتھ باقی نظام بھی شامل کیجیے: ہر نماز کے وقت مسواک، وضو میں ناک میں پانی چڑھانا اور کلی کرنا، برتن ڈھانپنے کا حکم، پینے کی چیز میں سانس لینے کی ممانعت، ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت، اور غسل کا واجب ہونا۔ ایک مکمل صحتی نظام جو جرثومی نظریے سے بارہ صدیاں پہلے وضع ہو گیا۔

مآخذ Ignaz Semmelweis — childbed fever, 1847–1861 · WHO — *Guidelines on Hand Hygiene in Health Care*, 2009

ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے... دس برس کا چیلنج

ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود ہلاک ہو گیا ۝ اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا، کچھ کام نہ آیا ۝ عنقریب وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا

سورہ المسد – آیات 1-3

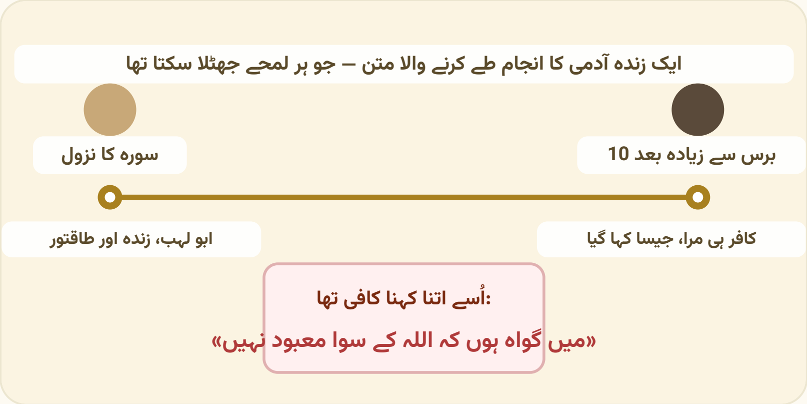

سب سے خطرناک متن جو لکھا جا سکتا ہے: ایک ایسے شخص پر حتمی فیصلہ جو ابھی مرا بھی نہیں

آسان لفظوں میں

ایک سورہ نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ نبی ﷺ کے چچا – ابو لہب – **آگ میں داخل ہوں گے**۔ یعنی وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اس کے بعد وہ دس برس سے زیادہ زندہ رہے، اور پورے قرآن کو گرا دینے کے لیے انہیں صرف اتنا کافی تھا کہ جھوٹ ہی سہی، کلمہ پڑھ لیتے – اور انھوں نے ایسا نہ کیا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ابو لہب دعوت کے سخت ترین دشمنوں میں سے تھے اور اسے نقصان پہنچانے پر سب سے زیادہ قادر، اور وہ نبی ﷺ کے چچا اور قریش کے ایک سردار تھے۔ اور کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ آنے والے دنوں میں کوئی آدمی کیا بن جائے گا – کتنے ہی سخت دشمن تھے جو لمبی عداوت کے بعد مسلمان ہوئے، جیسے عمر بن خطاب، خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ابو لہب غزوۂ بدر کے چند دن بعد مرے – یعنی سورہ کے نزول کے دس برس سے زیادہ عرصے بعد – **اپنے کفر پر**، ایسے مرض سے کہ ان کے اپنے گھر والے ان سے دور بھاگے۔ اور سیرت و تاریخ کی تمام کتابیں اس پر متفق ہیں، اور اسلام کے مخالفوں میں سے بھی کسی نے اس میں جھگڑا نہیں کیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ کسی دور کی ایسی بات کی پیش گوئی نہیں جس پر کسی کا کوئی اختیار نہ ہو – بلکہ **ایک زندہ آدمی کے اپنے اختیار کے بارے میں ہے جو اسے اپنے کانوں سے سن رہا تھا**۔ اور وہی اس دعوت کو ڈھا دینے کا سب سے زیادہ حریص تھا۔ اس کے سامنے دس برس سے زیادہ کا وقت تھا کہ ایک جملہ کہہ دیتا – خواہ جھوٹ اور دکھاوے ہی کے طور پر – تو متن اسی دن ڈھ جاتا اور دعوت اسی دن ختم ہو جاتی۔ **اس چیلنج کو دس برس سے زیادہ کھلا چھوڑنا، پھر اس کا ٹھیک اسی طرح بند ہونا جیسا کہا گیا تھا، ایسا خطرہ ہے جو کوئی انسان مول نہیں لیتا**۔ اس پر یہ بھی کہ سورہ نے یہی فیصلہ ان کی بیوی پر بھی سنایا، اور وہ بھی کفر ہی پر مریں۔ دو میں سے دو، دونوں ایک ساتھ، جھٹلانے کے دس برس سے زیادہ مواقع کے بعد۔

یوسف کا «بادشاہ»... اور موسیٰ کا «فرعون»

> اور بادشاہ نے کہا: اسے میرے پاس لاؤ، میں اسے اپنے لیے خاص کر لوں ... اور فرعون نے کہا: مجھے چھوڑو، میں موسیٰ کو قتل کروں
>
> سورہ یوسف 54 — اور سورہ غافر 26

شاہی لقب کا بدلنا ایک ایسی حقیقت ہے جو ہیروگلیفی کے حل ہونے سے پہلے معلوم ہی نہ تھی

آسان لفظوں میں

قرآن یوسف کے زمانے کے مصری حکمران کو **«بادشاہ»** کہتا ہے، اور موسیٰ کے زمانے کے حکمران کو **«فرعون»** — اور ان میں کبھی خلط نہیں کرتا۔ علمِ مصریات کہتا ہے کہ بالکل یہی درست ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرۂ عرب میں نہ مصر کے حکمرانوں کے القاب کا کوئی علم تھا اور نہ ان کے بدلنے کی تاریخ کا۔ اور پورے خطے میں مشہور یہی تھا کہ ہر مصری حکمران کو بلا تفریق «فرعون» کہہ دیا جائے۔ بلکہ **خود تورات یوسف کے حکمران کو «فرعون» کہتی ہے**، سِفرِ پیدائش میں بار بار۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

لفظ «فرعون» کی مصری اصل **«پر-عا» (pr-ʿ3)** ہے، جس کے معنی ہیں «بڑا گھر» — یعنی خود محل، نہ کہ حکمران کی ذات۔ اور قدیم اور وسطیٰ دونوں سلطنتوں کے پورے دور میں یہی رہا۔ اور **خود حکمران کے لیے** یہ لقب نئی سلطنت سے پہلے استعمال نہیں ہوا، تقریباً تحتمس سوم کے عہد میں (15 ویں صدی قبل مسیح)، اور اس کے بعد عام ہوا۔ اور یوسف کا زمانہ اس سے پہلے پڑتا ہے، اور موسیٰ کا اس کے بعد۔ اور یہ بات جدید مصریات کے مراجع میں طے شدہ ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اطراد ہی دلیل ہے۔ اگر یہ اتفاق ہوتا تو تقریباً تیس مقامات میں کم از کم ایک بار تو دونوں لقب گڈمڈ ہو جاتے۔ لیکن قرآن اس فرق کو پوری طرح نبھاتا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ قوی بات یہ ہے کہ وہ **اپنے زمانے میں اہلِ کتاب کے درمیان رائج تورات کے متن کی مخالفت کرتا ہے** — اور وہی واحد ماخذ ہے جس سے نقل کرنے کا الزام اس پر لگایا جاتا ہے۔ اگر نقل کرنے والا کوئی انسان ہوتا تو غلطی بھی ساتھ ہی نقل کر لیتا۔ اور اس تصحیح کا درست ہونا ہیروگلیفی کے حل ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا، ایک ہزار برس سے بھی زیادہ بعد۔

مآخذ Britannica — “Pharaoh” · Gardiner — *Egypt of the Pharaohs*, 1961

علقہ: ایک لٹکی ہوئی چیز جو خون چوستی ہے

اُس نے انسان کو علق سے پیدا کیا

سورہ العلق – آیت 2

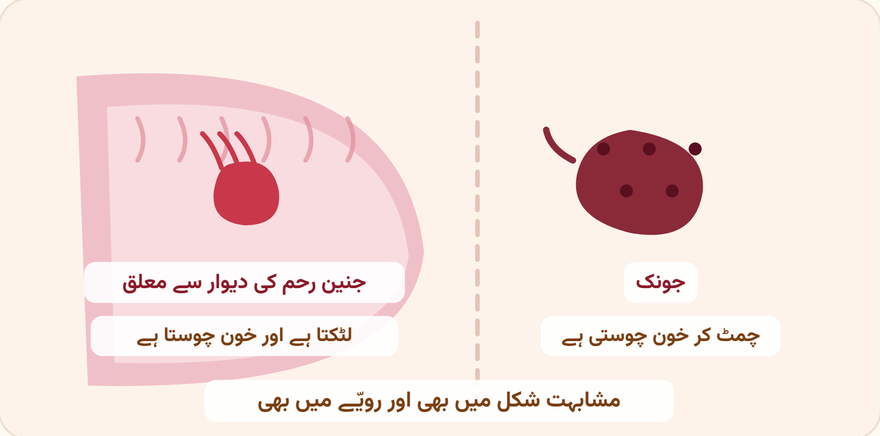

تیسرے ہفتے کا جنین: اُس کی شکل اور کام وہی ہیں جو جونک کی شکل اور کام ہیں

آسان لفظوں میں

عربی میں لفظ «علق» کے تین معنی ہیں: **لٹکی ہوئی** چیز، خون چوسنے والی **جونک**، اور **جما ہوا خون**۔ اور جنین اِس مرحلے میں تینوں معنی ایک ساتھ جمع کر لیتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کسی نے تیسرے ہفتے کا جنین نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا حجم دو ملی میٹر سے بھی کم ہے اور خوردبین کے بغیر دکھائی نہیں دیتا۔ ارسطو اور جالینوس نے کہا: جنین پودے کی جڑوں جیسی نالیوں سے رحم سے جڑتا ہے اور ماں کے خون سے غذا لیتا ہے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ شروع کیسے ہوتا ہے: **وہ رحم کی اندرونی جھلی میں دھنستا ہے اور اُس میں معلق ہو جاتا ہے**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چھٹے دن بلاسٹوسسٹ رحم کی اندرونی جھلی میں پیوست ہوتا ہے اور **اُس سے معلق** ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کے خلیے ماں کی خون کی نالیاں کھودتے ہیں، یہاں تک کہ خون اُس کے گرد کے خلا بھر دیتا ہے – یعنی وہ **لفظاً خون چوستا ہے**۔ اور تیسرے ہفتے کے جنین کی خوردبینی تصویریں اُسے ایسی شکل میں دکھاتی ہیں جو خم اور پہلو کی بندشوں تک میں جونک سے جا ملتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تینوں معنی کا ایک ہی لفظ میں جمع ہو جانا ہی اعجاز ہے۔ اگر صرف لٹکنا مراد ہوتا تو «معلقہ» کہا جاتا، اور اگر صرف خون مراد ہوتا تو «دم» کہا جاتا۔ مگر «علقہ» ایک ہی وقت میں بیان کرتا ہے: **جگہ** (دیوار سے معلق)، اور **غذا** (خون چوستا ہے)، اور **شکل** (جونک جیسی)، اور **مادہ** (گرد جما ہوا خون)۔ چار خوردبینی حقیقتیں اُس ایک لفظ میں، جو خوردبین کی ایجاد سے ہزار برس پہلے ایک اُمّی شخص پر اُتارا گیا۔

مآخذ Moore & Persaud — *The Developing Human* (implantation)

پہاڑ چل رہے ہیں اور آپ اُنہیں ٹھہرا ہوا سمجھتے ہیں

اور آپ پہاڑوں کو دیکھتے ہیں، اُنہیں جما ہوا سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہیں۔

سورہ نمل — آیت 88

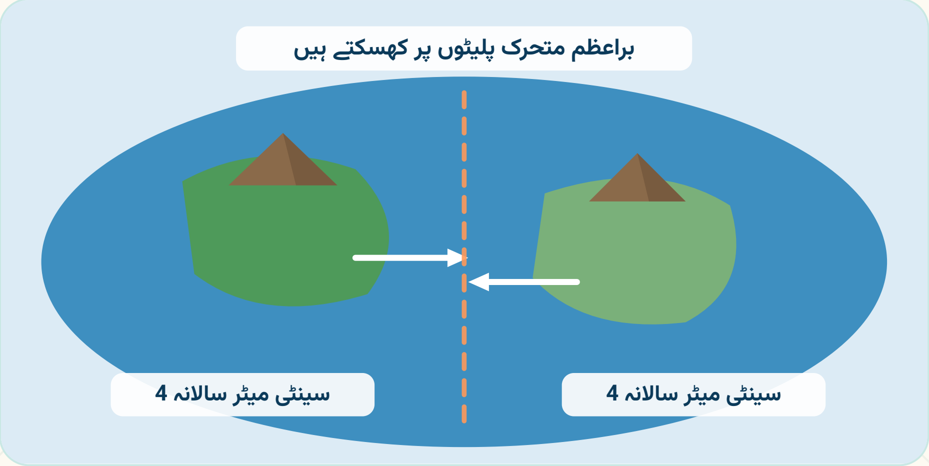

پورے پورے براعظم بہت آہستہ چل رہے ہیں، اور جو کچھ اُن پر ہے وہ اُن کے ساتھ چلتا ہے

آسان لفظوں میں

پہاڑ آپ کو کھڑے ہوئے، بے حرکت دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ **چل رہے ہیں** — اِتنے آہستہ کہ آپ کی آنکھ اُسے پکڑ نہیں پاتی، بالکل ویسے ہی جیسے بادل کو ایک لمحے کے لیے دیکھیں تو اُس کی حرکت نظر نہیں آتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تمام انسانوں کے نزدیک پہاڑ مطلق ثبات کی علامت تھے۔ «پہاڑ جیسا مضبوط» ہر زبان کی کہاوت ہے۔ اور کسی نے یہ دعویٰ نہ کیا کہ خود زمین اُن کے نیچے سے کھسک رہی ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ارضی پلیٹوں کا نظریہ، جو بیسویں صدی کی ساٹھ کی دہائی سے طے شدہ ہے: زمین کی قِشر دیو ہیکل تختوں میں بٹی ہوئی ہے جو تیرتے اور کھسکتے ہیں، اور براعظموں اور پہاڑوں کو چند سینٹی میٹر سالانہ کی رفتار سے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ آج یہ حرکت مصنوعی سیّاروں سے ناپی جاتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

خود تشبیہ ہی برہان ہے: «اُنہیں جما ہوا سمجھتے ہیں» — یعنی اُن کا ٹھہرا ہونا صاف طور پر **نظر کا دھوکا** ہے۔ پھر «بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہیں» — اور بادل **افقی، آہستہ اور اجتماعی** حرکت کرتے ہیں، نہ گرتے ہیں نہ اچھلتے۔ سو آیت نے ایک حقیقی حرکت بیان کی اور ساتھ یہ بھی بتایا کہ وہ نظر کیوں نہیں آتی۔ اور اِس سے بھی باریک بات: پہاڑ اکیلے نہیں چلتے، بلکہ **اپنے گِرد کی ہر چیز سمیت** چلتے ہیں — بالکل بادلوں کی طرح۔

ماخذ Wegener — *Die Entstehung der Kontinente und Ozeane*, 1915 · U.S. Geological Survey — understanding plate motions

کائنات ہر لمحے پھیل رہی ہے

اور آسمان کو ہم نے قوّت سے بنایا، اور بےشک ہم اُسے وسعت دینے والے ہیں

سورہ ذاریات – آیت 47

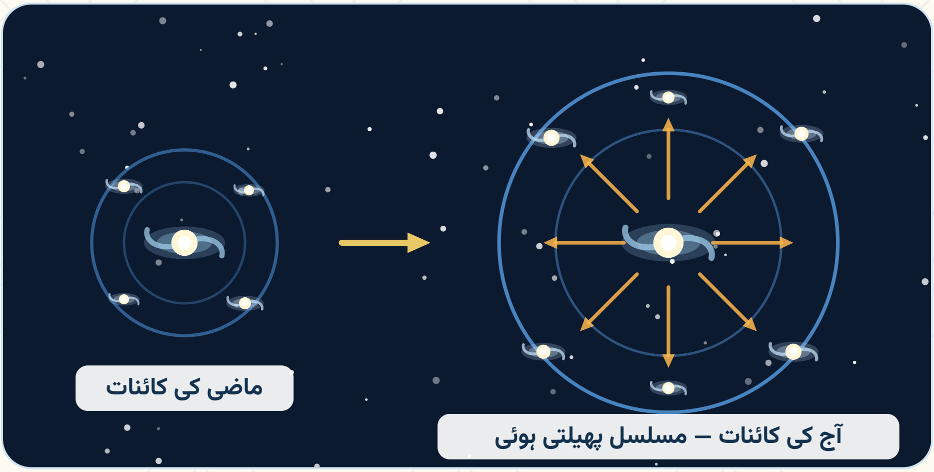

کہکشائیں دور ہٹ رہی ہیں، جیسے پھولتے غبارے پر بنے نقطے

آسان لفظوں میں

تصوّر کیجیے ایک غبارہ ہے جس پر آپ نے چھوٹے چھوٹے نقطے بنا رکھے ہیں، پھر آپ اُسے پھلاتے ہیں۔ ہر نقطہ اپنے پڑوسی سے دور ہٹ جاتا ہے۔ کائنات بالکل یہی کر رہی ہے: آسمان اپنی عمر کے ہر لمحے پھیل رہا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ – بلکہ بڑے بڑے فلسفی اور سائنس دان بھی – یہی سمجھتے تھے کہ کائنات **ساکن اور ثابت** ہے، ایک ہی حجم کی، جو نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے۔ یہ عقیدہ بیسویں صدی تک چھایا رہا، یہاں تک کہ آئن اسٹائن نے خود اپنی مساواتوں میں ایک مصنوعی مستقل شامل کیا تاکہ کائنات کو ساکن رہنے پر مجبور کر سکے!

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

1929 میں ایڈون ہبل نے مشاہدہ کیا کہ دور کی کہکشاؤں کی روشنی **سرخی کی طرف مائل** ہے، یعنی وہ ہم سے بھاگ رہی ہیں۔ اور جتنی دور ہوں، اُتنی ہی تیز بھاگتی ہیں۔ کائنات پھیل رہی ہے۔ اور 1998 میں معلوم ہوا کہ یہ پھیلاؤ **تیز تر ہوتا جا رہا ہے**، اور اِس کے دریافت کنندگان کو 2011 میں نوبل انعام ملا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت میں استعمال ہونے والا لفظ «مُوسِعون» ہے – یہ اسمِ فاعل ہے جو ایسے کام پر دلالت کرتا ہے جو **مسلسل ہے اور رُکتا نہیں**، نہ کہ ماضی کا «ہم نے پھیلایا»۔ یعنی پھیلانا اِس وقت جاری ہے۔ جزیرۂ عرب کے ریگستان میں ایک اُمّی شخص، جس کے پاس نہ دوربین تھی نہ طیف پیما، ایسا جملہ کہتا ہے جو پوری انسانیت کے اجماع کے خلاف ہے – اور پھر تاریخ کی سب سے بڑی فلکیاتی دریافت آ کر حرف بہ حرف اُس کی تصدیق کرتی ہے۔ اِس کی توجیہ نہ اتفاق سے ہو سکتی ہے نہ ذہانت سے۔

ماخذ Nobel Prize in Physics 2011 · Riess et al. (1998) — accelerating expansion · Hubble (1929), PNAS 15

سورج چراغ ہے… اور چاند نور

> بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے، اور اُس میں ایک چراغ اور روشنی دینے والا چاند رکھا۔
>
> **سورہ فرقان — آیت 61**

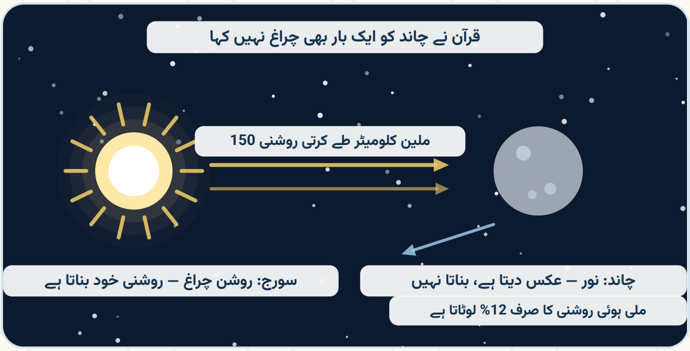

لفظوں کا ایک باریک فرق، جو ایک ایسے طبیعی فرق کے عین مطابق ہے جو صدیوں تک معلوم نہ تھا

آسان لفظوں میں

سورج خود سے روشن ہے کیونکہ وہ جل رہا ہے۔ اور چاند کی اپنی کوئی روشنی ہے ہی نہیں — وہ ایک تاریک پتھر ہے جو سورج کی روشنی ہم پر لوٹاتا ہے۔ اور قرآن سورج کو ہمیشہ **سِراج** اور **وَہّاج** اور **ضِیاء** کہتا ہے، اور چاند کو ہمیشہ **نور** اور **مُنیر** — اور پوری کتاب میں ایک بار بھی یہ دونوں وصف آپس میں نہیں بدلتے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

روشنی کے سرچشمے اور اُس کے عکس دینے والے میں فرق کرنا معلوم نہ تھا۔ بلکہ قومیں سورج اور چاند دونوں کو دو روشن معبود سمجھ کر پوجتی تھیں، اور دیومالاؤں نے دونوں کو برابر درجے پر «دو روشنیاں» اور «آسمان کی دو آنکھیں» کہا۔ ننگی آنکھ اُن میں فرق نہیں کرتی: دونوں آسمان میں چمکتے قرص ہیں، بلکہ چاند نظر کے لیے زیادہ ٹھنڈا ہے سو خالص نور سے قریب تر لگتا ہے۔ انکساغورس نے مسیح سے چار صدیاں پہلے کہا تھا کہ چاند ایک زمینی جسم ہے جو سورج کی روشنی لوٹاتا ہے — مگر یہ یونانی حلقوں میں ایک نظری رائے تھی، جزیرۂ عرب تک نہ پہنچی، اور دوربین کے بعد ہی رصد سے ثابت ہوئی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سورج ایک حرارتی جوہری ری ایکٹر ہے: اپنے مرکز میں **ڈیڑھ کروڑ درجے** حرارت پر ہائیڈروجن کو ہیلیم میں بدلتا ہے، اور یوں روشنی اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ رہا چاند، تو وہ ٹھنڈا پتھریلا جسم ہے جو اپنی طرف سے کوئی نظر آنے والی روشنی نہیں دیتا؛ اور اُس میں سے ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سورج کی لوٹی ہوئی روشنی ہے۔ اور **اُس کی عکس پذیری (Albedo) تقریباً 0.12** ہے — یعنی جو روشنی اُس پر پڑتی ہے اُس کا تقریباً 12% لوٹاتا ہے اور باقی نگل لیتا ہے؛ اُس کی سطح حقیقت میں تارکول جیسی سیاہ ہے۔ اِسی لیے اُس کی منزلیں بدلتی ہیں: ہم اُس کا صرف روشن حصّہ دیکھتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

عربی اِن دو لفظوں میں فرق کرتی ہے: **سِراج** وہ ہے جو اپنی آگ اپنے اندر رکھتا ہے، اور **نور** وہ ہے جو جلے بغیر روشنی دے۔ اور مفسّرین نے دوربین سے صدیوں پہلے اِس فرق کو صاف لکھا ہے۔

اور دلیل کسی ایک آیت میں نہیں، جسے اتفاق کہا جا سکے، بلکہ **پوری کتاب میں اِس کے تسلسل** میں ہے: سورہ نبأ میں سورج کے لیے «چراغِ فروزاں»، سورہ نوح میں «چاند کو اُن میں نور بنایا اور سورج کو چراغ بنایا»، سورہ یونس میں «سورج کو ضِیاء اور چاند کو نور»، اور سورہ فرقان میں «ایک چراغ اور روشن چاند»۔ چار مقام، اور تقسیم ایک ہی ہے، بگڑتی نہیں۔

اگر یہ اتفاق ہوتا تو تیئیس برس کی اُس وحی میں، جو واقعات کے ساتھ ٹکڑوں میں اُترتی رہی، یہ دونوں وصف کم از کم ایک بار جگہ بدل لیتے۔ **اتفاق اِس قدر پابند نہیں ہوتا**، اور کہنے والے کے پاس یہ جاننے کا ایک ذریعہ بھی نہ تھا کہ اِن میں سے کون جلتا ہے اور کون لوٹاتا ہے۔

مآخذ NASA NSSDC — *Moon Fact Sheet* (geometric albedo 0.12) · NASA — *Sun: Facts* (nuclear fusion) · الطبري — «جامِعُ البَيان» (الفَرقُ بين الضِّياءِ والنّور)

دونوں ایک ھی چیز تھے... پھر جدا ہو گئے

> کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں باھم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دیا؟
>
> **سورہ انبیا — آیت 30**

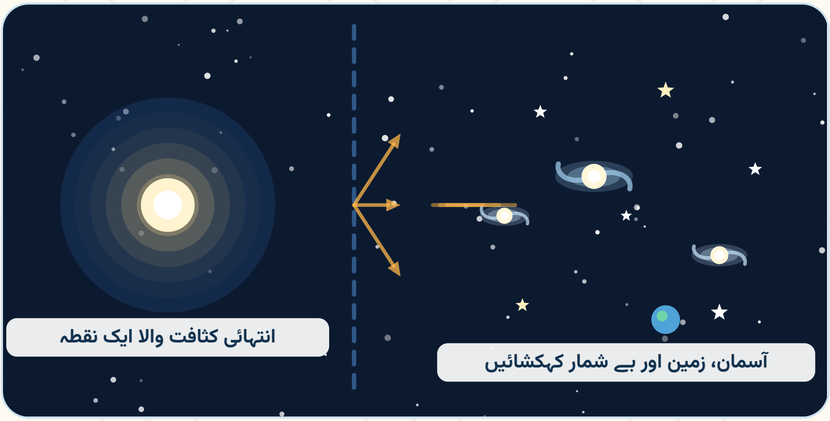

ایک جڑے ہوئے تودے سے لے کر کہکشاؤں سے بھری ہوئی پھیلتی کائنات تک

آسان لفظوں میں

قرآن کہتا ہے: آسمان اور زمین شروع میں **باہم چپکے ہوئے** ایک ہی چیز تھے، پھر اللہ نے اُنہیں پھاڑ کر جدا کر دیا۔ بالکل جیسے ایک چھوٹا سا بیج کھلتا ہے اور اُس میں سے پورا درخت نکل آتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

«کائنات کی کوئی ابتدا» کا تصوّر سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ عقیدہ یہ تھا کہ کائنات **ازلی ہے، اُس کی کوئی ابتدا نہیں**۔ اور جنھوں نے کسی آغاز کا خیال باندھا، اُنھوں نے لڑتے ہوئے دیوتاؤں کے قصے گھڑ لیے، نہ کہ ایک ہی جسم کے مادّی انفصال کا تصوّر۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نظریۂ عظیم دھماکا (بگ بینگ)، جو آج دنیا بھر میں مسلّمہ نمونہ ہے: پوری کائنات **ایک ہی جڑی ہوئی، انتہائی کثیف اور انتہائی گرم حالت** سے شروع ہوئی — نہ کہ فضا کے کسی کونے میں کوئی گولا پھٹا — پھر خود فضا کے ہر مقام پر بیک وقت پھیلنے سے وہ پھٹ کر الگ ہوئی۔ اور تین دلیلوں سے اِس کی تصدیق ہو چکی ہے: کہکشاؤں کا ایک دوسرے سے دور ہٹنا، 1965 میں دریافت ہونے والی «کائناتی پس منظر کی شعاعیں» (جو اُس آغاز کی باقی ماندہ حرارت ہیں)، اور کائنات میں ہائیڈروجن اور ہیلیم کا تناسب۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

عربی میں «رَتْق» کا معنیٰ ہے: وہ چیز جو جُڑی ہوئی اور بند ہو، اور «فَتْق» کا معنیٰ ہے اُسے چیر کر جدا کرنا۔ یہ ایسا دقیق بیان ہے جو کسی تاویل کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اور اِس سے اہم بات یہ ہے کہ آیت اِسے کافروں کے سامنے **چیلنج کی دلیل** کے طور پر پیش کرتی ہے («کیا کافروں نے نہیں دیکھا») — یعنی وہ اِس پر شرط باندھ رہی ہے کہ یہ ایک دن سامنے آئے گا۔ اور 1300 سال بعد یہ سامنے آ گیا، اور اِس کے دو دریافت کنندگان کو 1978 میں نوبل انعام ملا۔

مآخذ Penzias & Wilson (1965), Astrophysical Journal 142 · Nobel Prize in Physics 1978 · NASA / WMAP — Big Bang cosmology

26

پہاڑ زمین میں گاڑی ہوئی میخیں ہیں

کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا، اور پہاڑوں کو میخیں؟

سورہ نبأ — آیات 6–7

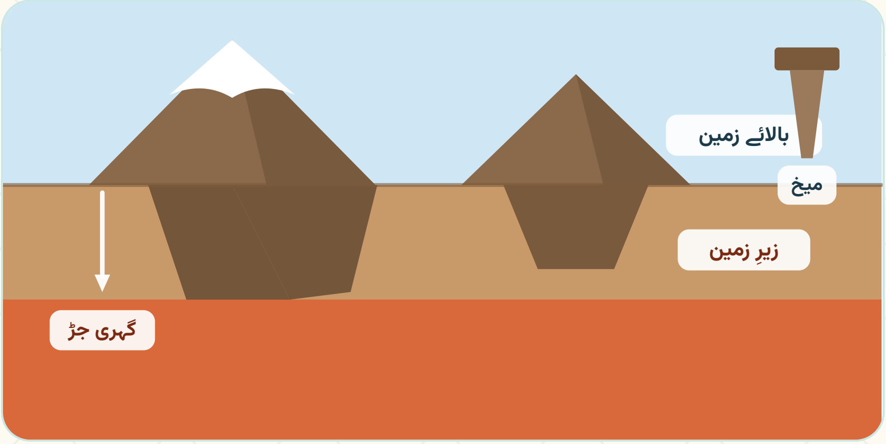

پہاڑ خیمے کی میخ جیسا ہے: ظاہر تھوڑا، اور زمین میں گڑا ہوا حصّہ اُس سے کئی گنا

آسان لفظوں میں

جس میخ سے آپ خیمہ گاڑتے ہیں اُس کا ظاہر حصّہ چھوٹا ہوتا ہے اور زمین میں گڑا ہوا حصّہ بڑا۔ پہاڑ بھی بالکل ایسے ہی ہیں: اُن کی **زمین کے نیچے گہری جڑیں** ہیں، اُس سے کئی گنا جو آپ اوپر دیکھتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کی نظر میں پہاڑ پتھر کا ایک ڈھیر تھا جو زمین کی سطح **پر** رکھ دیا گیا ہو، جیسے میز پر کوئی پتھر۔ کسی کے پاس یہ جاننے کا کوئی راستہ نہ تھا کہ اُس کے نیچے کوئی سلسلہ بھی ہے، کیونکہ کھدائی کم گہرے کنوؤں سے آگے نہ جاتی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ارضیات اِسے **«پہاڑوں کی جڑیں»** کہتی ہے: ہر پہاڑ زمین کی قِشر میں اِتنی گہرائی تک اترتا ہے جو عموماً اُس کی ظاہری بلندی سے پانچ گنا ہوتی ہے۔ اور یہی جڑیں **پہاڑ کو اٹھائے رکھتی ہیں اور اُس کے بوجھ کو متوازن کرتی ہیں**، سو قِشر مینٹل پر اُس بلندی پر تیرتی ہے جو اُس کی موٹائی اور کثافت طے کرتی ہے — اور یہی «قِشری توازن» کہلاتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

لفظ «وَتَد» (میخ) صرف حجم کی یا نوکدار شکل کی تشبیہ نہیں؛ عربی میں میخ وہ چیز ہے جس کی تعریف اُس کے کام سے ہوتی ہے: **ایسا جسم جس کا بیشتر حصّہ دفن ہو تاکہ اوپر والی چیز کو تھامے رکھے۔** سو آیت نے پہاڑوں کو دو ایسی خصوصیتیں دیں جو معلوم نہ تھیں: سطح کے نیچے کا سلسلہ، اور تھامنا۔ اور اِس سے پہلے والی بات دیکھیے: «زمین کو بچھونا» — یعنی ایسا فرش جو حرکت کر سکتا ہے، سو میخیں اُسے تھامنے کے لیے آئیں۔

مآخذ Airy (1855) — isostasy · U.S. Geological Survey — the earth's crust and mountain roots

دو سمندر جو ملتے ہیں اور گھلتے نہیں

اُس نے دو سمندر بہائے جو آپس میں ملتے ہیں؛ اُن کے درمیان ایک برزخ ہے، وہ اُس سے آگے نہیں بڑھتے۔

سورہ رحمٰن – آیات 19–20

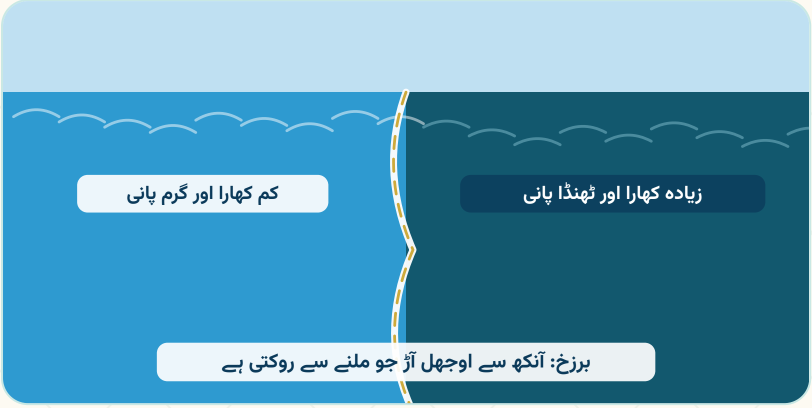

دو پانی جو نمکیات اور حرارت میں مختلف ہیں، اور اُن کے درمیان ایک ایسا حاجز جو آنکھ نہیں دیکھتی اور آلات پڑھ لیتے ہیں

آسان لفظوں میں

جب دو مختلف سمندر ملتے ہیں تو وہ فوراً آپس میں نہیں مل جاتے، جیسا آپ سمجھتے ہیں۔ اُن کے درمیان ایک **حاجز** باقی رہتا ہے جو ایک کے پانی کو دوسرے کے پانی سے جدا رکھتا ہے، سو ہر سمندر اپنا رنگ، اپنا کھاراپن اور اپنی حرارت تھامے رہتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ہر انسان کے نزدیک یہ بدیہی تھا کہ پانی جب پانی سے ملے تو فوراً اُس میں گھل جاتا ہے — جیسے دو پیالے پانی کے مل جاتے ہیں۔ اور پانی اور پانی کے درمیان کسی «دیوار» کا تصوّر ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

علمِ بحار **حقیقی آبی حاجزوں** کا وجود ثابت کرتا ہے، جنہیں «فرنٹ» اور «ہیلوکلائن» کہتے ہیں: نمکیات، کثافت اور حرارت کا فرق ایک تنگ منتقلی علاقہ بناتا ہے جو **کثافت میں نہایت تیزی سے بدلتا** ہے، سو بھاری پانی ہلکے کے نیچے سرک جاتا ہے، اور دونوں صرف اُس وقت گھلتے ہیں جب کوئی اضطراب بھاری پانی کو کششِ ثقل کے خلاف اٹھائے۔ اور یہ آبنائے جبل الطارق پر ناپا جا چکا ہے: بحیرۂ روم کا زیادہ کھارا اور بھاری پانی تقریباً ایک سو بیس میٹر گہرائی پر بحرِ اوقیانوس کے **نیچے** سے سرکتا ہوا نکلتا ہے، پھر نیچے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک ایسا حاجز جو آنکھ نہیں دیکھتی، اور آلات پڑھ لیتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے صرف عدمِ اختلاط کا ذکر کر کے بس نہیں کیا؛ اُس نے سبب کا نام لیا: «**برزخ**» — اور عربی میں برزخ وہ حاجز ہے جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہو۔ پھر اُس کا اثر بیان کیا: «لا يَبغِيان» یعنی اُن میں سے کوئی دوسرے پر زیادتی نہیں کرتا۔ یہ ایک ایسے مظہر کا بیان ہے جو بیسویں صدی میں نمکیات اور کثافت کی آلاتی پیمائش سے پہلے دریافت ہی نہ ہوا تھا۔ اور ایک دوسری آیت میں وصف اور بھی باریک ہو گیا: «اور اُن کے درمیان ایک برزخ اور **روکی ہوئی آڑ** بنا دی»۔

مآخذ Sverdrup, Johnson & Fleming — *The Oceans*, 1942 · NOAA — ocean fronts and haloclines

میٹھا اور خوشگوار... اور کھاری اور کڑوا

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا کر چلایا، یہ میٹھا خوشگوار اور یہ کھاری کڑوا، اور ان دونوں کے درمیان ایک برزخ اور ایک روکی ہوئی آڑ رکھ دی

سورہ الفرقان – آیت 53

دریاؤں کے دہانوں پر میٹھا پانی کھاری کے اوپر ایک واضح حد کے ساتھ تیرتا ہے

آسان لفظوں میں

جب میٹھا دریا کھاری سمندر میں گرتا ہے تو دونوں پانی فوراً نہیں ملتے۔ ان کے درمیان ایک **حاجز** باقی رہتا ہے جسے مصنوعی سیّارے صاف دیکھ لیتے ہیں، اور جو دسیوں کلومیٹر تک پھیلا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سب لوگوں کے نزدیک پانی تو پانی ہے، جو بداہتاً پانی سے مل جاتا ہے۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ میٹھا پانی کھاری سے **کثافت میں ہلکا** ہے، اور یہی فرق اکیلا دونوں کو تہ در تہ کر دیتا ہے، سو میٹھا اس کے اوپر ایک ایسی تہ میں تیرتا ہے جو نہایت سست رفتاری ہی سے گھلتی ہے۔ رہا ان دونوں کے درمیان کی چیز کو «روکی ہوئی آڑ» کہنا، تو یہ ایک عجیب تعیین ہے جس کی عام مشاہدے میں کوئی نظیر نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بڑے دریاؤں کے دہانوں پر – جیسے ایمیزون، کانگو اور مسیسپی – میٹھا پانی سمندر میں دسیوں کلومیٹر تک **اپنا رنگ اور اپنی کثافت سنبھالے** چلا جاتا ہے، اور جدائی کی لکیر خلا سے دکھائی دیتی ہے۔ اور سبب کثافت، نمکیات اور حرارت کا اختلاف ہے، جس سے ایک تنگ انتقالی علاقہ بنتا ہے جسے **«ہیلوکلائن»** کہتے ہیں اور وہ گھلنے کو سخت سست کر دیتا ہے۔ اور خلابازوں نے اس منظر کی بارہا تصویریں لی ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اس آیت اور سورہ الرحمٰن کی آیت کے درمیان ایک ایسا باریک فرق ہے جس کی طرف صرف وہی متوجہ ہوتا ہے جو جانتا ہو۔ سورہ الرحمٰن میں بات دو کھاری سمندروں کی ہے جن کی خاصیتیں مختلف ہیں، اور ان کے درمیان کا فاصل ایک ہی لفظ سے آیا: «برزخ»۔ رہا یہاں – جہاں ملاقات **میٹھے اور کھاری** کے درمیان ہے – تو یہاں ایک دوسری صفت بڑھا دی گئی: **«اور ایک روکی ہوئی آڑ»**، یعنی ایک پکی، سخت ممانعت۔ اور طبیعی سبب واضح ہے: میٹھے اور کھاری کے درمیان کثافت کا فرق دو کھاری پانیوں کے فرق سے **کہیں زیادہ شدید** ہے، سو جدائی زیادہ واضح اور زیادہ مضبوط ہے۔ سو لفظ کی شدت ٹھیک ٹھیک مظہر کی شدت کے مطابق آئی۔

مآخذ NOAA — estuaries, where fresh water meets the sea · Sverdrup, Johnson & Fleming — *The Oceans*, 1942

جتنا بلند چڑھیں گے، اُتنا سینہ تنگ ہوگا

اور جسے وہ گمراہ کرنا چاہے، اُس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان میں چڑھ رہا ہو

سورہ الانعام — آیت 125

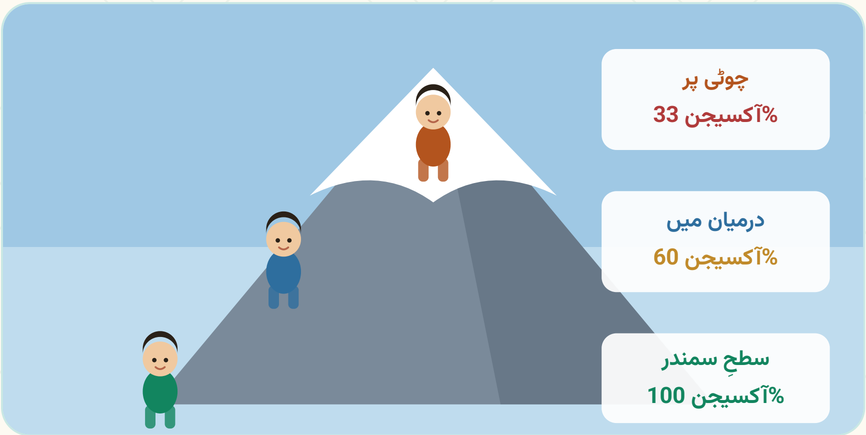

جتنا اوپر جائیں گے آکسیجن اُتنی کم ہوگی، تو سانس تنگ ہوگا اور گھٹن بڑھے گی

آسان لفظوں میں

اگر آپ کسی بہت بلند پہاڑ پر چڑھیں تو محسوس کریں گے کہ سینہ تنگ ہو رہا ہے اور سانس لینا مشقت بن گیا ہے۔ جتنا اوپر جائیں گے، سینہ اُتنا ہی تنگ ہوگا۔ اور قرآن نے اِسے منہ موڑنے والے کے سینے کی تنگی کی **مثال** بنایا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس ماحول میں انسان زیادہ سے زیادہ کسی معمولی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچا تھا، اور کوئی بلندی اور تنگیِ سانس کے درمیان **درجہ بہ درجہ** ربط نہ جوڑتا تھا۔ بلکہ یہ تک معلوم نہ تھا کہ ہوا کا کوئی وزن یا دباؤ ہے؛ ٹوریچیلی نے فضائی دباؤ 1643 سے پہلے ناپا ہی نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جتنا اوپر چڑھیں گے فضائی دباؤ اُتنا گھٹے گا اور خون تک پہنچنے والی آکسیجن اُتنی کم ہوگی۔ 3500 میٹر پر یہ سطحِ سمندر کی قدر کا تقریباً 60% رہ جاتی ہے، اور کوہِ ایورسٹ کی چوٹی پر تقریباً 33%۔ نتیجہ تنگیِ سانس، سینے کی گھٹن اور سر درد ہے — جسے **بلندی کا مرض** کہتے ہیں۔ اِسی لیے ہوائی جہازوں میں مصنوعی دباؤ کے نظام لگائے جاتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایک ہی فقرے میں تین باریکیاں۔ پہلی: چڑھائی اور سینے کی تنگی کو باہم جوڑنا ہی۔ دوسری: لفظ «حَرَجاً» تنگی کے بعد مزید تنگی کا مفہوم دیتا ہے — یعنی شدت میں تدریج۔ تیسری اور سب سے باریک: صیغہ «**يَصَّعَّدُ**» — صاد اور عین کی تشدید کے ساتھ — عربی میں چڑھائی کی مشقت اور تھوڑا تھوڑا کر کے اُسے جھیلنے کا مفہوم دیتا ہے، محض بلند ہونے کا نہیں۔ تو خود صیغہ وہ تدریج اُٹھائے ہوئے ہے جسے آج علمِ وظائفِ اعضا بیان کرتا ہے۔

ماخذ John B. West — *High Life*, 1998 · Torricelli — the barometer, 1643

30

بار آور ہوائیں — پودوں اور بادلوں کو بیاہتی ہیں

اور ہم نے بار آور ہوائیں بھیجیں، پھر آسمان سے پانی اُتارا اور اُس سے آپ کو سیراب کیا

سورہ الحجر – آیت 22

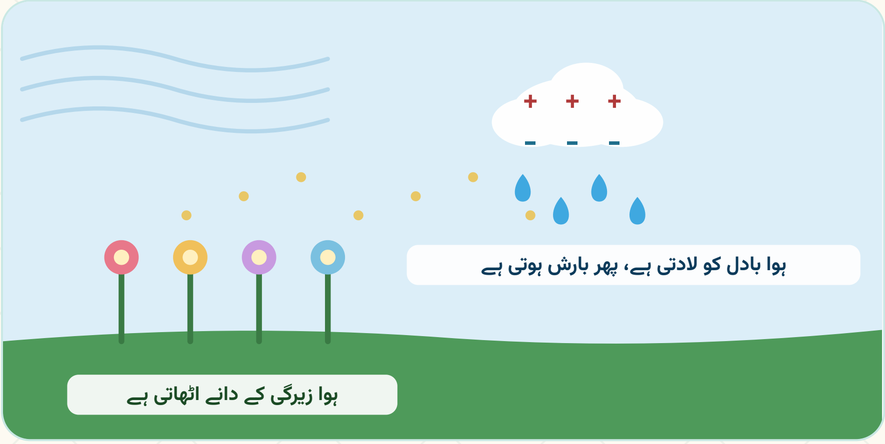

ہوا پودوں کو زیرِ گل سے بار آور کرتی ہے، اور بادلوں کو برقی بار اور گرد سے

آسان لفظوں میں

ہوا صرف چیزوں کو ہلاتی نہیں — وہ **بیاہتی** ہے۔ وہ زیرِ گل ایک پھول سے دوسرے پھول تک لے جاتی ہے تو وہ پھل لاتے ہیں، اور گرد اور برقی بار بادل تک لے جاتی ہے تو وہ برستا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ہوا محض دھکیلنے اور ڈھونے کی طاقت تھی: جہاز چلاتی اور گرد اُڑاتی۔ رہا یہ کہ اُس کا **بار آوری میں کوئی کردار** ہے، تو یہ معلوم نہ تھا؛ بلکہ یہ تک ثابت نہ تھا کہ پودوں میں نر اور مادہ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ 1694 میں جرمن عالم کامیراریوس نے یہ ثابت کیا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ہوا سے زیرگی ہزاروں نباتاتی انواع کے تولید کا ذریعہ ہے — گندم، چاول، مکئی، کھجور اور صنوبر۔ اور بادلوں میں: ہوا گرد اور نمک کے **تکثیفی مرکزے** لے جاتی ہے جن کے گرد آبی بخارات لپٹ کر قطرے بن جاتے ہیں، اور وہ بادل کے اوپر اور نیچے کے درمیان برقی بار الگ کر دیتی ہے تو بجلی بنتی ہے اور بارش اُترتی ہے۔ اِن مرکزوں کے بغیر بادل سرے سے برستا ہی نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

«لَواقِح» «لاقِح» کی جمع ہے، اور عربی میں فعل «لَقَّحَ» خاص بار آوری اور جوڑا ملانے کے لیے ہے — اِسی سے کھجور کی تلقیح ہے، جو عرب کھجور ہی میں ہاتھ سے کرنا جانتے تھے۔ تو اِس فعل کو خود **ہوا** کی طرف منسوب کرنا ایک ایسے کردار کا اثبات ہے جو معلوم نہ تھا۔ اور اِس سے بھی باریک بات: آیت نے بار آوری کے فوراً بعد بارش کا اُترنا رکھا («فأنزلنا») — یعنی ہوا بادل کو بھی بار آور کرتی ہے تو وہ بارش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی حرف بہ حرف جدید علمِ موسمیات ہے۔

ماآخذ “Pollination — *Britannica* · *De sexu plantarum epistola*, 1694 — Camerarius”

آسمان میں پہاڑ، اور اُن میں اولے

اور وہ آسمان سے، اُس میں جو پہاڑ ھیں اُن میں سے، اولے اُتارتا ھے، پھر جسے چاھتا ھے اُن سے پہنچاتا ھے

سورہ النور — آیت 43

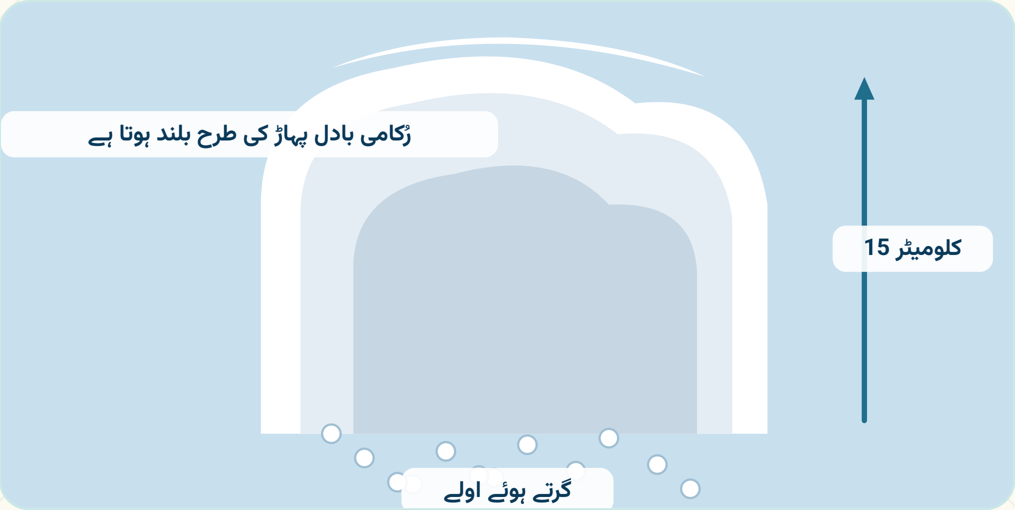

رُکام بادل: ایک عظیم تودہ جو عمودی بلند ہوتا ہے گویا آسمان میں کوئی پہاڑ ہو

آسان لفظوں میں

اولے — برف کے دانے — ہر بادل سے نہیں گرتے۔ وہ صرف اُن بھاری بادلوں سے گرتے ہیں جو **آسمان میں پہاڑوں کی طرح بلند ہوتے ہیں**، جن کی بلندی زمین کے سب سے اونچے پہاڑ سے کئی گنا ہوتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زمین سے بادل ایک اُفقی پھیلی ہوئی سطح دکھائی دیتا ہے، پہاڑ نہیں۔ اور بادل کی بلندی جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ یہ سمجھنے کا کہ بادلوں کی شکلیں اور بلندیاں مختلف ہوتی ہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اولے صرف **رُکامی مُزنی بادل** میں بنتے ہیں: ایک عمودی تودہ جس کی بلندی 8 سے 15 کلومیٹر ہوتی ہے — یعنی کوہِ ایورسٹ سے بھی اونچی۔ اُس کے اندر اُٹھتے دھارے پانی کے قطرے کو بار بار اوپر لے جاتے ہیں جہاں وہ تہ پر تہ جم جاتا ہے، یہاں تک کہ بھاری ہو کر گر پڑے۔ اِسی لیے اگر آپ ایک اولہ چیر دیں تو اُس میں درخت کے تنے کے حلقوں جیسے حلقے نظر آئیں گے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ تعبیر چند لفظوں میں تین باتیں دیتی ہے: بادل کی ایک **پہاڑی، عمودی** صورت ہوتی ہے؛ اولے اُن کے **اندر** ہوتے ہیں، اُن کے اوپر نہیں؛ اور وہ **انہی سے** گرتے ہیں، باقی بادلوں سے نہیں۔ اور یہی حصر آیت کی سب سے باریک بات ہے، اور زمین پر کھڑا کوئی شخص اِسے جان نہیں سکتا۔

نطفۂ امشاج... ملا ہوا پانی

بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تا کہ اُسے آزمائیں، پھر اُسے سننے والا دیکھنے والا بنایا

سورہ الانسان — آیت 2

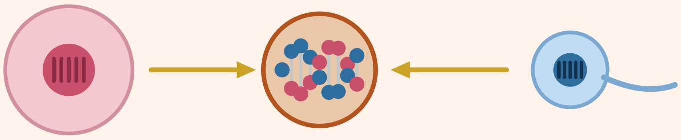

پہلا خلیہ ایک چیز نہیں، بلکہ دو والدین کے دو نصفوں کا آمیزہ ہے

آسان لفظوں میں

انسان کی ابتدا کوئی ایک پانی نہیں — بلکہ دو مادوں کا **آمیزہ** ہے: آدھا باپ سے اور آدھا ماں سے، جو آپس میں گھل مل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عام عقیدہ یہ تھا کہ بچہ صرف مرد کے پانی سے بنتا ہے، اور ماں محض **ایک برتن اور وہ زمین ہے جس میں بیج اُگتا ہے**۔ یہ ارسطو کی صریح عبارت ہے، اور صدیوں طب پر چھائی رہی۔ اور عورت کا بیضہ 1827 میں کارل فون بیئر کے ہاتھوں ہی دریافت ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بارآوری: 23 کروموسوم اٹھائے ہوئے ایک سپرم 23 کروموسوم اٹھائے ہوئے بیضے سے مل جاتا ہے، اور 46 کروموسوم والا ایک ہی خلیہ بنتا ہے، جو پورے انسان کی اصل ہے۔ سو پہلا نطفہ دو برابر اجزا کا **حقیقی آمیزہ** ہے، کوئی ایک ہی مادہ نہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

لفظ «**امشاج**» «مَشَج» کی جمع ہے، اور لغتوں میں اِس کے معنی: ایسے آمیزے جو ایک دوسرے میں اِس قدر گھل مل جائیں کہ ایک کو دوسرے سے پہچانا نہ جا سکے۔ اور یہ ایک واحد کی صفت ہے («نطفہ» واحد ہے) — یعنی وہ ایک ہی نطفہ خود آمیزے ہے۔ اور یہ ارسطو کے اُس مذہب کی تصحیح کرتا ہے جو دو ہزار برس دنیا پر حکومت کرتا رہا۔ اور ایک دوسری آیت میں مزید تفصیل ہے: «اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا»، پھر «نطفے سے، جب وہ ٹپکایا جائے» — اور قرآن نر و مادہ کے فرق کو نطفے کی طرف منسوب کرتا ہے، رحم کی طرف نہیں۔

مآخذ Moore & Persaud — *The Developing Human* · von Baer — *De ovi mammalium et hominis genesi*, 1827

پیٹھ اور سینے کی ھڈیوں کے درمیان سے

> پس انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا، جو پیٹھ اور سینے کی ھڈیوں کے درمیان سے نکلتا ھے
>
> **سورہ طارق — آیات 5-7**

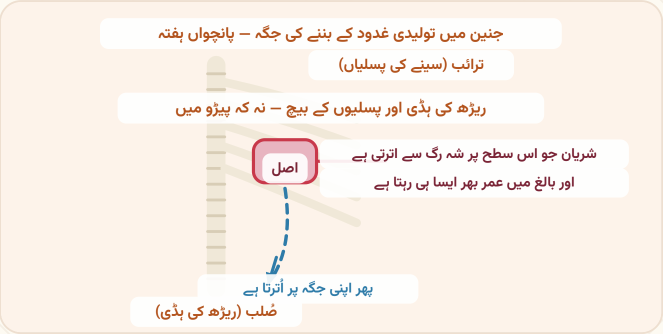

غدود یہیں بنتا ہے، پھر نیچے اترتا ہے… اور اس کی شریان کبھی ساتھ منتقل نہیں ہوتی

آسان لفظوں میں

آیت کہتی ہے کہ تخلیق کا پانی **پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے** نکلتا ہے — یعنی **ریڑھ کی ہڈی** اور **سینے کی ہڈیوں** کے بیچ سے۔ اور علمِ جنین کہتا ہے کہ **تولیدی غدود بالکل اسی جگہ بنتا ہے**، اور اس کے بعد ہی اپنی معلوم جگہ کی طرف اترتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم تشریح عضو کو وہیں دیکھتی تھی جہاں وہ اسے پاتی تھی۔ بقراط، جالینوس اور ان کے بعد والوں نے تخلیق کے پانی کا سرچشمہ کبھی دماغ میں تلاش کیا اور کبھی بدن کے سارے اعضا میں۔ رہا یہ کہنا کہ اس کا سرچشمہ **پیٹ کے بالائی حصے میں پیٹھ اور سینے کے درمیان ایک جگہ سے لگا ہوا ہے** — ایسی جگہ جس کا بظاہر کسی چیز سے کوئی تعلق نہیں — تو یہ مشاہدے سے کبھی اخذ نہیں ہو سکتا، کیونکہ عضو کا بننا صرف اس جنین میں نظر آتا ہے جس کی لمبائی چند ملی میٹر ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پانچویں ہفتے میں تولیدی غدود اس چیز پر ظاہر ہوتا ہے جسے **بولی تناسلی ابھار** کہتے ہیں؛ یہ ایک پٹی ہے جو پیٹ کی پچھلی دیوار سے نچلے چھاتی کے اور بالائی کمر کے مہروں کی سطح پر چپکی ہوتی ہے — یعنی **ٹھیک ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے پنجرے کے درمیان**۔ پھر وہ ایک لمبے سفر میں اپنی آخری جگہ کی طرف اترتا ہے۔

اور **پیچھے رہ جانے والا نشان اصل کو ہمیشہ کے لیے ثابت کر دیتا ہے**: اسے غذا پہنچانے والی شریان پڑوس کی شرونی رگوں سے نہیں نکلتی، جیسا کہ اس کی موجودہ جگہ کا تقاضا ہے، بلکہ **دوسرے کمر کے مہرے کے پاس بطنی شہ رگ** سے اترتی ہے — جہاں وہ پہلے تھا۔ اور یہی حال اس کی لمفی نالیوں اور اعصاب کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی رسولی پیٹ کے بالائی حصے کی گانٹھوں تک پھیلتی ہے، شرونی گانٹھوں تک نہیں — اور یہ ایک عملی قاعدہ ہے جسے سرطان کا ہر معالج جانتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

جو بات ٹھہرنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ **یہ وصف اس سے مطابقت نہیں رکھتا جو آنکھ دیکھتی ہے**۔ جو مشاہدے سے بیان کرتا ہے وہ اس جگہ کا ذکر کرتا ہے جہاں وہ عضو کو پاتا ہے، نہ کہ اس جگہ کا جسے عضو ولادت سے مہینوں پہلے چھوڑ چکا۔ چنانچہ متن ایک **منشا** کی طرف اشارہ کرتا ہے، **مستقر** کی طرف نہیں — اور عجیب بات یہی ہے۔

اور یہاں ایک حد ہے جو صاف کہہ دینی چاہیے: پہلے مفسرین نے آیت کو «مرد کی پیٹھ اور عورت کے سینے» پر سمجھا، اور یہ ایک وجیہ لغوی فہم ہے جو رد نہیں کیا جاتا۔ ہم یہاں یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ تشریحی تفسیر ہی متعین ہے، اور نہ ہم اکیلے اسی پر بنیاد رکھتے ہیں۔ ہم جو کہتے ہیں وہ اسی میں محصور ہے: **کہ یہ دونوں لفظ حرف بہ حرف اس جگہ کو بیان کرتے ہیں جسے علمِ جنین نے تیرہ صدیوں بعد اس پانی کا منشا ثابت کیا**۔ اور یہ کہ یہی جگہ آج بھی ہر زندہ انسان کی تشریح میں اپنا اعلان کرتی ہے، ایک ایسی شریان کے راستے میں جس کی توضیح اس کے سوا درست نہیں ہوتی کہ عضو نے وہیں سے آغاز کیا تھا۔

مآخذ Moore & Persaud — *The Developing Human* (the genital ridge) · The genital ridge — where the gonad first forms · The gonadal artery — still arising from the aorta at L2

لڑکا یا لڑکی... فیصلہ باپ کا ہے

> اور یہ کہ اُسی نے جوڑا پیدا کیا — نر اور مادہ — نطفے سے، جب وہ ٹپکایا جاتا ہے
>
> سورہ نجم – آیات 45–46

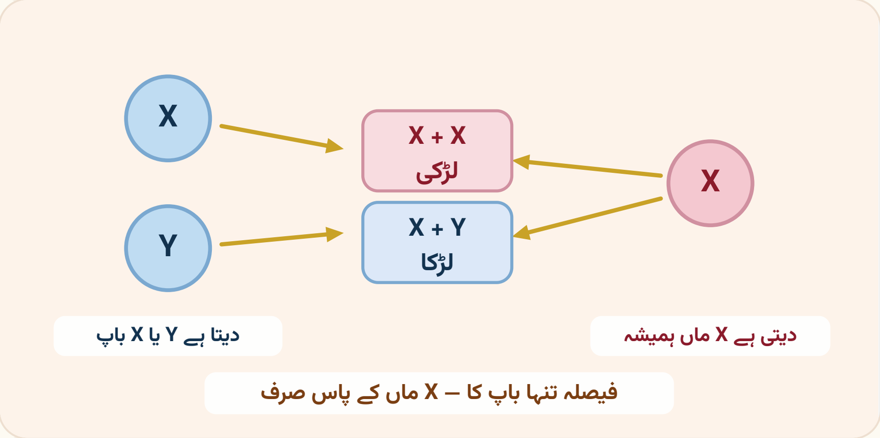

بچے کی جنس بارآوری کے لمحے ہی طے ہو جاتی ہے — اُس کے مطابق جو جرثومۂ منویہ لے کر آتا ہے

آسان لفظوں میں

بچہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ یہ فیصلہ ماں کا کبھی نہیں ہوتا — بلکہ **باپ** کا ہے۔ کیونکہ ماں کے پاس صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے، جبکہ باپ دونوں قسمیں رکھتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عورتوں کو بیٹیاں جننے پر ملامت کی جاتی تھی — اور بعض معاشروں میں آج بھی کی جاتی ہے — اور عورت کو صرف اِس لیے طلاق دے دی جاتی تھی کہ وہ «بیٹے نہیں جنتی»۔ یونانی فلسفی انباذقلیس کا یہ نظریہ عام تھا کہ جنس کا فیصلہ رحم کی حرارت کرتی ہے، اور صدیوں تک طب میں یہی مانا گیا کہ لڑکا رحم کی دائیں جانب سے ہوتا ہے اور لڑکی بائیں جانب سے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جنسی کروموسوم: عورت XX ہے اور مرد XY۔ بیضہ ہمیشہ X رکھتا ہے، بغیر کسی استثنا کے؛ جبکہ جرثومۂ منویہ X بھی رکھ سکتا ہے اور Y بھی۔ اگر بیضہ X والے جرثومے سے ملے تو بچہ لڑکی ہوگا، اور اگر Y والے سے ملے تو لڑکا۔ **یعنی جنس کا تعین مکمل طور پر باپ کی طرف سے ہوتا ہے۔** یہ 1905 میں نیٹی سٹیونز نے دریافت کیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نر اور مادہ کے جوڑے کی تخلیق کو **نطفے سے، جب وہ ٹپکایا جاتا ہے** منسوب کرتی ہے — اور جو فعل یہاں آیا ہے وہ خاص مرد کے پانی کے لیے ہے۔ یوں سرچشمہ بغیر کسی اِبہام کے متعین کر دیا گیا۔ اگر یہ کلام اِنسانی ہوتا، ایسے ماحول میں جہاں بچے کی جنس پر عورت کو ملامت کی جاتی تھی، تو محفوظ راستہ یہی تھا کہ خاموش رہتا یا رواج کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ مگر اِس نے **رائج تہذیبی تصور کی صریح مخالفت کی اور معاملہ باپ کی طرف منسوب کیا** — اور تیرہ صدیوں بعد سائنس اِس کی تصدیق کرنے آ گئی۔

مآخذ Nettie M. Stevens — *Studies in Spermatogenesis*, 1905

35

تین اندھیروں میں

❖ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، تخلیق کے بعد تخلیق، تین اندھیروں میں ❖

سورہ زمر — آیت 6

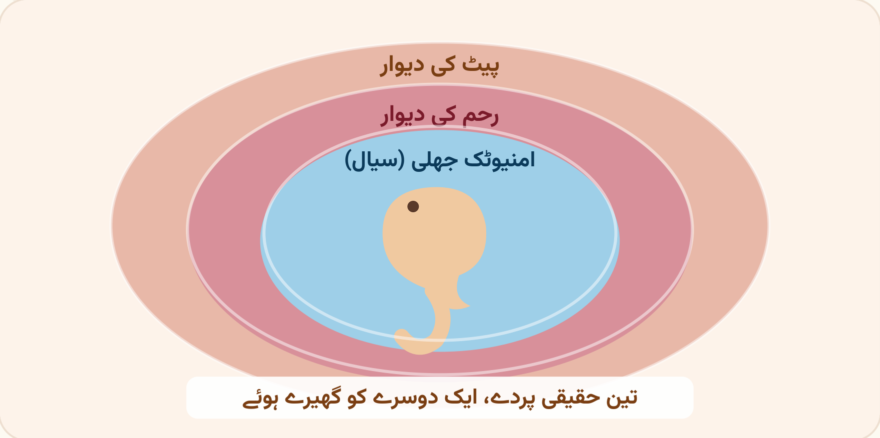

تین تہ بہ تہ پردے: پیٹ کی دیوار، پھر رحم کی دیوار، پھر جنینی جھلّیاں

آسان لفظوں میں

پیٹ کا بچہ کسی ایک تاریک کمرے میں نہیں ہوتا — بلکہ **تین کمروں** میں، ایک دوسرے کے اندر: ماں کے پیٹ کی دیوار، پھر رحم کی دیوار، پھر پانی کی وہ تھیلی جو اُسے گھیرے ہوئے ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

نہ حاملہ عورتوں کی تشریح ہوتی تھی، نہ رحم کی ساخت کا کوئی علم تھا۔ بدیہی تصور یہی تھا کہ بچہ **ایک ہی اندھیرے** میں ہے: اپنی ماں کے پیٹ کے اندر۔ مگر تین متعین اندھیروں کو گن کر بتانا ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے ایک ایک تہ کو الگ الگ جاننا ضروری ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جنین کو تین یکے بعد دیگرے پردے گھیرے ہوئے ہیں: **پیٹ کی اگلی دیوار**، پھر **رحم کی دیوار** اپنی تین عضلاتی تہوں کے ساتھ، پھر **جنینی جھلّیاں** (امنیون اور کوریون) اور اُن کے درمیان کا سیال۔ اِن میں سے ہر ایک بذاتِ خود روشنی روکتا ہے، اور یہ باہر سے اندر کی طرف بالکل اُسی ترتیب سے ہیں جس ترتیب سے ذکر ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ کن بات عدد ہے۔ قرآن نے نہ «اندھیرے میں» کہا، نہ مبہم طور پر «اندھیروں میں»، بلکہ متعین کیا: «**تین**»۔ اور عدد کی تعیین، اگر غلط ہو، فوراً جھٹلائی جا سکتی ہے۔ پھر یہ ایک اور نہایت باریک تعبیر کے ساتھ آیا: «تخلیق کے بعد تخلیق» — یعنی پے در پے مراحل، جن میں سے ہر مرحلہ اپنے سے پہلے والے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ یوں ایک ہی آیت میں **جگہ کا اُس کی تہوں سمیت** اور **وقت کا اُس کے مراحل سمیت** بیان جمع ہو گیا۔

مآخذ Moore & Persaud — amnion, chorion, decidua

مُضغہ: دانتوں کے نشان والا لوتھڑا

پھر مُضغے سے، جو شکل پا چکا ہو اور جو نہ پایا ہو، تاکہ ہم تم پر واضح کر دیں

سورہ حج – آیت 5

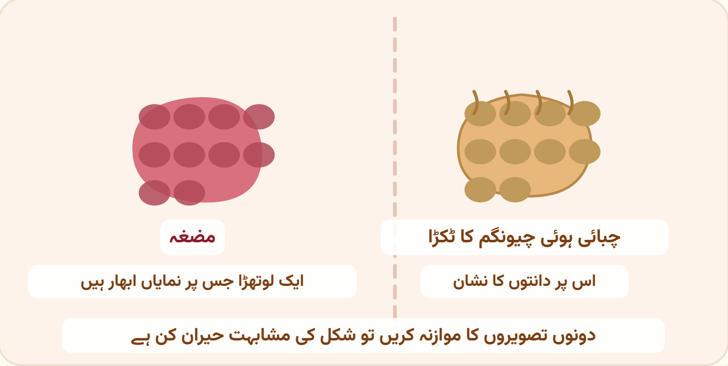

چوتھے ہفتے کا جنین: اُبھرے ہوئے سومائٹ، جیسے چبائے ہوئے لقمے پر دانتوں کے نشان

آسان لفظوں میں

عربی میں «مُضغہ» کے معنی ہیں **وہ لقمہ جسے آپ نے اپنے دانتوں سے چبایا ہو**۔ اور جنین اِس مرحلے میں ایک چھوٹا سا لوتھڑا ہے جس پر اُبھار اور گڑھے ہیں، بالکل جیسے چیونگم کے ٹکڑے پر دانتوں کے نشان۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اِس مرحلے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اِسے تصور کرنے کی کوئی کوشش جنین کو یا تو خون بتاتی، یا ننھے اِنسان کی شکل۔ مگر اِسے **چبائی ہوئی وہ چیز جس پر دانتوں کے نشان ہوں** کہنا ایسی عجیب تعبیر ہے جو اُس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی جس نے اِسے دیکھا نہ ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چوتھے ہفتے میں جنین کی پشت پر یکے بعد دیگرے ڈلیاں نمودار ہوتی ہیں جنہیں **سومائٹ (Somites)** کہتے ہیں، اور اِن کے درمیان گہرے شگاف ہوتے ہیں، جس سے جنین چبائے ہوئے ٹکڑے جیسا لگتا ہے۔ ماہرِ جنینیات کیتھ مور نے اِس مرحلے کے جنین کے پہلو میں چیونگم کا چبایا ہوا ٹکڑا رکھ کر تصویر لی، اور مشابہت حیران کن تھی۔ اِن میں سے بعض اعضا بن جاتی ہیں اور بعض ختم ہو جاتی ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ کن بات **لفظ کا انتخاب** ہے۔ اُس زمانے میں بیان کرنے والے کے سامنے دو ہی راستے تھے، تیسرا کوئی نہیں: یا تو کہتا کہ یہ **خون** ہے، یا کہتا کہ یہ **پورے اعضا والا ننھا اِنسان** ہے — اور یہی دو قول تھے جو دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ مگر وہ ایک تیسری بات لایا جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھی: **چبایا ہوا لقمہ جس پر دانتوں کے نشان ہیں**۔ اور یہ ایسی تعبیر نہیں جو محض لفظی خوبصورتی کے لیے کہی جائے، کیونکہ یہ اُن کے کسی تصور سے مشابہ ہی نہیں تھی — اور اِس پر وہی پہنچ سکتا ہے جس نے اِسے دیکھا ہو۔
پھر یہ کوئی اکیلا لفظ نہیں جو تنہا کھڑا ہو، بلکہ **ایک ترتیب کی کڑی** ہے: نطفہ، پھر علقہ، پھر مُضغہ۔ تین عام عربی لفظ، اور ہر ایک وہی بیان کرتا ہے جو خوردبین اُس کے مرحلے میں دکھاتی ہے، **اور اُسی ترتیب سے جس ترتیب سے یہ واقعی ہوتا ہے**۔
اور ایک حد پر رُک جائیے: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ «مُخَلَّقہ اور غیر مُخَلَّقہ» سے مراد خلیوں کا تمیز پانا اور اُن میں سے بعض کی طے شدہ موت ہے۔ **ہم یہاں اِس پر کچھ بھی بنیاد نہیں رکھتے:** کیونکہ ابن عباس، مجاہد، شعبی اور ابن مسعود سے جو منقول ہے وہ یہ ہے کہ مُخَلَّقہ سے مراد **پوری بن چکی** ہے اور غیر مُخَلَّقہ سے مراد **ساقط ہو جانے والی**؛ اور آیت کا سیاق بھی اِسی کی تائید کرتا ہے، کیونکہ اِس کے بعد آتا ہے: «**اور ہم رحموں میں جسے چاہتے ہیں ٹھہرائے رکھتے ہیں**»۔ دلیل تنہا «مُضغہ» پر قائم ہے، اور جو بات ثابت نہ ہو اُسے رد کر دینے سے اِسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا — بلکہ یہی چیز اِسے دلیل بناتی ہے۔

مآخذ الدُّرَرُ السَّنيّة — تفسيرُ سورةِ الحجّ ٥ · O'Rahilly & Müller — *Developmental Stages in Human Embryos* · Moore & Persaud — the somites

ہر زندہ چیز — اصل میں پانی سے

> اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔ تو کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے؟
>
> **سورہ الانبیاء — آیت 30**

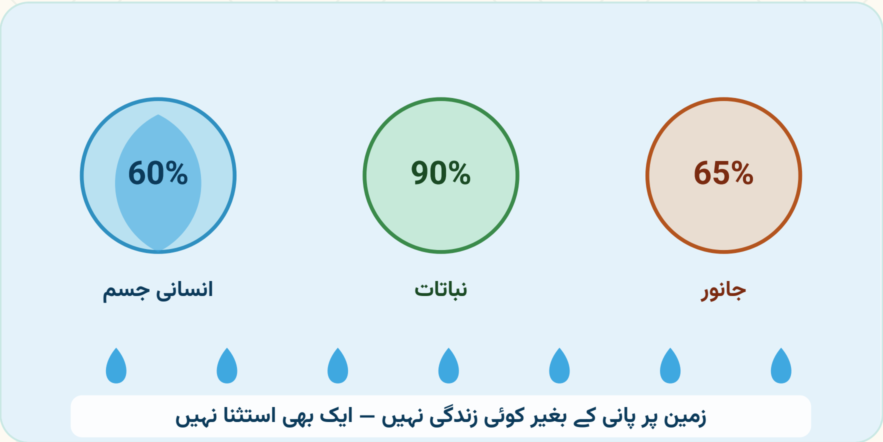

آج تک معلوم ہر زندہ مخلوق کو پانی درکار ہے اور اُس کے بغیر اُس کا قیام نہیں

آسان لفظوں میں

ہر زندہ چیز — انسان ہو، جانور، پودا، یا سب سے چھوٹا جرثومہ — **اصل میں پانی سے ہے**، اور اُس کے بغیر جی نہیں سکتی۔ آپ کا اپنا جسم تقریباً 60% پانی ہے — اور جس دن آپ پیدا ہوئے، تقریباً 78%۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ایک بنجر صحرا میں، جہاں پانی نایاب تھا اور زیادہ تر زمین ریت اور پتھر، سب سے دور کی بات یہ تھی کہ پانی **ہر** زندہ چیز کی اصل ہو۔ اور فلسفی اشیا کی اصل میں آگ، ہوا، مٹی اور پانی کے درمیان اختلاف کرتے رہے، اور کسی کے پاس فیصلہ کن دلیل نہ تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زندہ خلیہ — جو ساری زندگی کی اکائی ہے — اپنی کمیت کا تقریباً 70% پانی ہے، اور اُسی میں تمام حیاتی تعاملات ہوتے ہیں۔ اور آج تک ایک بھی ایسی زندہ مخلوق معلوم نہیں جو پانی سے بےنیاز ہو۔ اِسی لیے خلائی ادارے جب کسی دوسرے سیارے پر زندگی تلاش کرتے ہیں تو سب سے پہلے **پانی** ڈھونڈتے ہیں — اُن کا اعلان کردہ نعرہ ہے: «پانی کے پیچھے چلیے»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز لفظِ «**ہر**» میں ہے۔ آیت نے یہ نہیں کہا کہ پانی زندگی کا ایک سبب ہے، نہ یہ کہ اکثر زندہ چیزیں پانی سے ہیں — بلکہ پانی کو بلا استثنا ہر زندہ چیز کی اصل بنایا۔ اور یہ **ایک کُلّی قاعدہ ہے، اِسی لیے قابلِ تکذیب**: صرف ایک ایسی زندہ مخلوق کا پایا جانا کافی ہے جسے پانی کی ضرورت نہ ہو، تو یہ گر جائے۔ اور سائنس نے چودہ صدیوں تک زمین کے ہر ماحول میں تلاش کیا — برف میں، آتش فشانی دراڑوں میں، سمندروں کی گہرائیوں میں، اور جوہری بھٹیوں کے اندر — اور ایک استثنا بھی نہ پایا۔

مآخذ *Alberts et al. — Molecular Biology of the Cell*

آگ سبز درخت کے اندر محفوظ ہے

وہی جس نے آپ کے لیے سبز درخت سے آگ بنائی، تو دیکھیے آپ اُسی سے سلگاتے ہیں

سورہ یٰسٓ – آیت 80

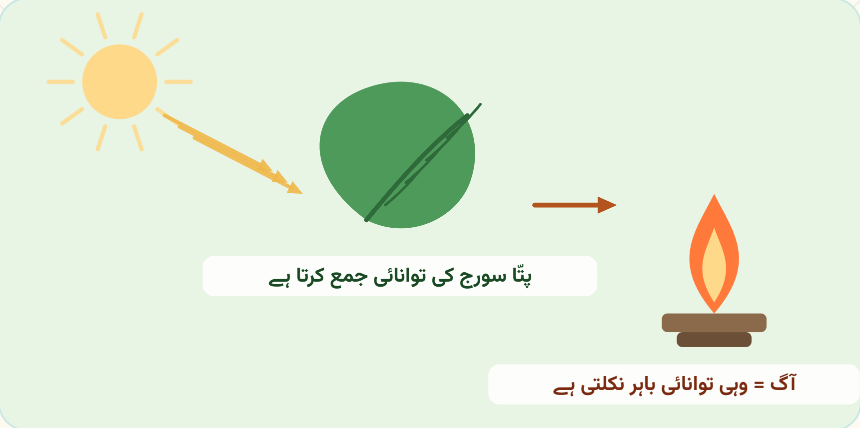

درخت سورج کی روشنی اپنے اندر جمع کرتا ہے، اور آگ اُسے دوبارہ چھوڑ دیتی ہے

آسان لفظوں میں

لکڑی میں جو آگ جلتی ہے وہ نئی نہیں – وہ **خود وہی سورج کی روشنی** ہے جسے درخت نے سبز اور زندہ رہتے ہوئے جمع کیا تھا۔ جب آپ لکڑی سلگاتے ہیں تو ایک پرانا قید سورج آزاد کرتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سبز اور تر ہر عقل میں آگ کی ضد ہے: سبز شاخ نہیں جلتی، خشک جلتی ہے۔ تو آگ کو خاص طور پر **«سبز درخت»** کی طرف منسوب کرنا روزمرہ مشاہدے کے خلاف لگا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ضیائی تالیف: سبز پتہ سورج کے فوٹون پکڑتا ہے اور اُنہیں کیمیائی توانائی میں بدل دیتا ہے جو شکر اور سیلولوز کے بندھنوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ جلنا بالکل اُلٹا عمل ہے: وہ اُن بندھنوں کو توڑ کر توانائی روشنی اور حرارت بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔ ہم جو ایندھن استعمال کرتے ہیں – لکڑی، کوئلہ، تیل اور گیس – وہ سورج کی وہی توانائی ہے جسے سبز پودے نے جمع کیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز تخصیص میں ہے۔ آیت نے «درخت سے آگ» نہیں کہا، بلکہ «**سبز** درخت سے» کہا – اور سبزی کی حالت ہی ضیائی تالیف اور ذخیرے کی حالت ہے۔ یعنی آگ اُس مرحلے کی طرف منسوب ہے جس میں توانائی **جمع کی جاتی ہے**، نہ اُس مرحلے کی طرف جس میں جلائی جاتی ہے۔ اور خشک لکڑی اُسی سے جلتی ہے جو اُس نے سبز رہتے ہوئے جمع کیا تھا۔ یہ ایک حالت اور نتیجے کے درمیان بالکل درست سببی ربط ہے، جو 1817 میں کلوروفل کی دریافت کے بعد ہی سمجھ میں آیا۔

ماخذ Pelletier & Caventou (1817) — chlorophyll · Taiz & Zeiger — *Plant Physiology*

اُنگلی کے نشان... آپ کی واحد شناخت

> کیا اِنسان سمجھتا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیاں جمع نہ کریں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اُس کی اُنگلیوں کے پور بھی درست بنا دینے پر قادر ہیں
>
> **سورہ قیامہ — آیات 3–4**

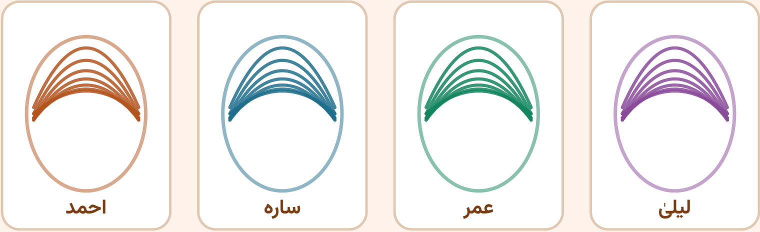

دو نشان کبھی نہیں ملتے — ہم شکل جڑواں کے بھی نہیں

آٹھ ارب اِنسان... آٹھ ارب مختلف نشان

آسان لفظوں میں

آپ کی اُنگلیوں کے پوروں پر باریک لکیریں ہیں۔ یہ **کسی دوسرے اِنسان میں کبھی نہیں دہرائی جاتیں** — حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں بھائی میں بھی نہیں جو ہر طرح آپ جیسا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُنگلیوں کے پور جلد کا ایک عام حصہ تھے؛ نہ کوئی اُنہیں دیکھتا تھا، نہ کوئی اُنہیں امتیازی سمجھتا تھا۔ لوگ قدیم زمانے سے مٹی پر اور معاہدوں پر ذاتی مہر کے طور پر اُنگلیاں ثبت کرتے آئے ہیں، مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ **منفرد ہیں اور کبھی نہیں دہرائی جاتیں**، نہ یہ کہ یہ عمر بھر قائم رہتی ہیں۔ شناخت کے لیے اِن کا باقاعدہ استعمال 1892 میں ارجنٹائن میں شروع ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پوروں کی لکیریں حمل کے دسویں ہفتے میں بنتی ہیں، اور جینز اور رحم کے اندر امنیوٹک سیال کے دباؤ کے ایک پیچیدہ تعامل سے متعین ہوتی ہیں، اور **بالکل منفرد** ہو کر سامنے آتی ہیں۔ یہ عمر بھر ثابت رہتی ہیں، نہ بدلتی ہیں نہ مٹتی ہیں، اور اوپری جلد جل جائے تب بھی جوں کی توں لوٹ آتی ہیں۔ اور دنیا بھر کے شناختی نظام اِنہی پر قائم ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

کلید سیاق ہے۔ آیت مُردوں کے اُٹھائے جانے اور ہڈیوں کے جمع کیے جانے کی بات کر رہی ہے۔ اور جب اِسے بعید سمجھنے والے کو جواب دیا جاتا ہے تو توقع یہی تھی کہ کہا جائے: کیوں نہیں، ہم اُس کی ہڈیاں جمع کرنے پر قادر ہیں۔ مگر جواب کہیں زیادہ باریک چیز کے ساتھ آیا: «ہم تو اُس کی **اُنگلیوں کے پور** بھی درست بنا دینے پر قادر ہیں»۔ چنانچہ پورے بدن کے سب حصوں میں سے خاص **پوروں** کو چُننا، اور وہ بھی اُس مقام پر جہاں بات کسی چیز کو **ہو بہو ویسا ہی** لوٹا دینے کی قدرت ثابت کرنے کی ہے، اِس کا اشارہ ہے کہ یہی انفرادیت اور شناخت کا مقام ہیں۔ اور یہ بارہ صدیوں بعد ہی معلوم ہو سکا۔

ماخذ Galton — *Finger Prints*, 1892 · Juan Vucetich — the first fingerprint identification, 1892

40

پر پھیلائے ہوئے، اور سمیٹتے ہوئے

> کیا اُنہوں نے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا، پر پھیلائے ہوئے، اور وہ سمیٹتے بھی ہیں؟ اُنہیں رحمٰن کے سوا کوئی نہیں تھامتا
>
> **سورہ ملک — آیت 19**

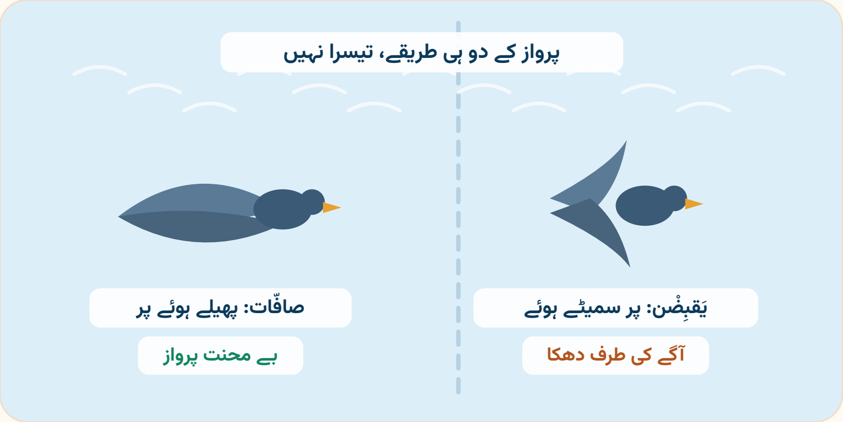

پھیلے ہوئے پر سے تیرنا اور سمٹے ہوئے پر سے پھڑپھڑانا: زمین کی ہر پرواز اِنہی دو میں سے ایک ہے

آسان لفظوں میں

پرندہ صرف دو طریقوں سے اُڑتا ہے: یا تو **اپنے دونوں پر پھیلا دیتا ہے** اور بغیر حرکت کے ہوا میں بہتا چلا جاتا ہے، یا **اُنہیں سمیٹ کر** پھڑپھڑاتا ہے تاکہ خود کو دھکیلے۔ اور قرآن نے یہی دونوں ذکر کیے، اور کچھ نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پرواز دیکھی جاتی تھی، اُس کا تجزیہ نہیں ہوتا تھا۔ کوئی پرواز کے دو اندازوں میں فرق نہیں کرتا تھا، نہ جانتا تھا کہ کون سا اُٹھان پیدا کرتا ہے اور کون سا دھکا۔ اور اِنسان صدیوں تک پھڑپھڑاہٹ کی نقل کر کے اُڑنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ایرو ڈائنامکس پرندوں کی پرواز کو دو ہی اندازوں میں بانٹتی ہے، تیسرا کوئی نہیں: **بادبانی تیراؤ** (Gliding/Soaring) — پھیلے ہوئے ساکن پر سے، جو اوپر اُٹھتی ہوا سے کام لیتا ہے — اور **پھڑپھڑاتی پرواز** (Flapping) — پر سمیٹ اور پھیلا کر دھکا پیدا کرنا۔ اور پہلے ہی اصول پر، یعنی پھیلے ہوئے ساکن پر، سارے ہوائی جہاز بنے ہیں۔ اِنسان اُسی وقت اُڑ سکا جب اُس نے پھڑپھڑاہٹ چھوڑ کر پھیلاؤ اپنایا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

پرواز کو دو ہی اندازوں میں محدود کر دینا پہلی باریکی ہے۔ دوسری باریکی **صیغے** میں ہے: «صافّات» اسمِ فاعل کے صیغے میں آیا ہے، جو ثبات اور دوام پر دلالت کرتا ہے، اور «یَقبِضن» فعلِ مضارع کے صیغے میں آیا ہے، جو تجدد اور وقفے وقفے سے ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور عین یہی وہ طبیعی فرق ہے: پر کا پھیلانا ایک مسلسل حالت ہے، اور سمیٹنا ایک بار بار دہرائی جانے والی حرکت۔ اور تیسری باریکی: «صافّات» کو «یَقبِضن» پر مقدم کرنا — کیونکہ پھیلا ہوا پر ہی وہ اصل ہے جو اُٹھان کی قوت پیدا کرتا ہے، اور پھڑپھڑانا اُس پر ایک اضافہ ہے۔

مآخذ Britannica — “Flight (animal locomotion) · ”Videler — Avian Flight, 2005

اصحابِ کہف کا کروٹ بدلنا... اور بستر کے زخم

> اور آپ انہیں جاگتا ہوا سمجھیں گے حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔ اور ہم انہیں دائیں اور بائیں کروٹ دلاتے تھے
>
> سورہ الکہف — آیت 18

آج ہر ہسپتال میں بستر پر پڑے مریض کی دیکھ بھال کا ضابطہ

آسان لفظوں میں

اصحابِ کہف بہت لمبی مدت سوئے رہے، اور اللہ **انہیں دائیں اور بائیں کروٹ دلاتا رہا**۔ اور آج طب کہتی ہے: جو مریض بے حرکت پڑا رہے **اس کی جلد پر زخم پڑ جاتے ہیں اور گوشت سڑنے لگتا ہے** — اور اس کا واحد علاج کروٹ بدلنا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کی نظر میں نیند خالص آرام تھی، جتنی بھی لمبی ہو اس میں کوئی نقصان نہیں۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ **جسم کا ایک ہی حالت پر ٹھہرے رہنا** بافتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ سو ایک لمبی نیند کے قصے میں کروٹ بدلنے کا ذکر ایک بے ضرورت تفصیل لگتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بستر کے زخم (Bedsores / Pressure Ulcers): یہ تب پیدا ہوتے ہیں جب جسم کا وزن ایک ہی مقام پر دباؤ ڈالے اور وہاں خون کی رسائی کٹ جائے، سو خلیے مر جاتے ہیں اور جلد پر زخم پڑتا ہے، پھر پٹھے پر، پھر ہڈی پر۔ اور بگاڑ مکمل بے حرکتی کے **صرف دو گھنٹے** کے اندر شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دیر تک بستر پر پڑے رہنے کی سب سے خطرناک پیچیدگیوں میں سے ہے اور جان لے سکتا ہے۔ اور عالمی منظور شدہ بچاؤ یہ ہے: **مریض کو دائیں اور بائیں کروٹ دلوائیے** — ہر دو سے تین گھنٹے بعد، اس کی حالت کے مطابق۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے کہ آیت نے کروٹ بدلنے کا ذکر نہ بے کار کیا ہے اور نہ قصے کی زینت کے طور پر۔ بلکہ یہ اس بیان کے سیاق میں آیا کہ **ان کے جسم اُس لمبی مدت میں کیسے محفوظ رکھے گئے**۔ اور یہ اس علم کا تقاضا کرتا ہے کہ ساکن جسم خراب ہو جاتا ہے، اور یہ کہ **کروٹ بدلنا ہی اس کا علاج ہے**۔ اور لفظ میں باریکی اور بھی بڑھ جاتی ہے: «دائیں اور بائیں» — اور یہ بعینہٖ وہی پہلو کے بل لٹانے کی وضع ہے جس کی طب سفارش کرتی ہے (تیس درجے کی وضع)، کیونکہ یہ دباؤ کو سرین اور کولھے سے اٹھا دیتی ہے، اور یہ دونوں سب سے خطرناک مقامات میں سے ہیں (اور ایڑیوں کے لیے ایک خاص سہارا ہوتا ہے جو انہیں بستر سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے)۔ پھر اسی آیت میں ایک اور تفصیل: «**اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے تھا**» — اور بازوؤں کا پھیلانا آرام کی وضع ہے، پہرے کی نہیں، اور کتا یہی کرتا ہے جب اس کا لیٹنا لمبا ہو جائے۔

مآخذ EPUAP · NPIAP — *Prevention and Treatment of Pressure Ulcers*

42 لوھا... اتارا گیا، یہاں بنا نہیں

اور ہم نے لوھا اتارا، جس میں سخت زور ہے اور لوگوں کے لیے فائدے۔

سورہ حدید — آیت 25

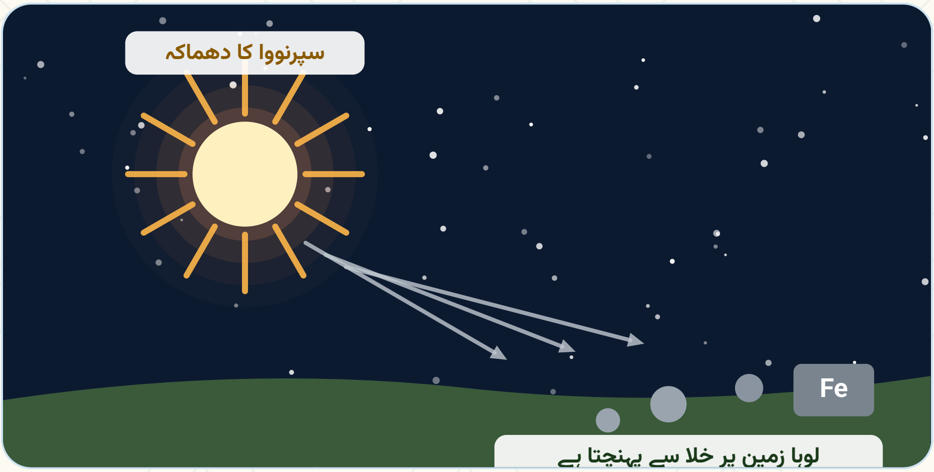

زمین کے لوہے کا ہر ذرّہ — اور آپ کے خون کا بھی — کسی ستارے کے اندر پیدا ہوا

آسان لفظوں میں

زمین کا سارا لوہا، حتّیٰ کہ وہ لوہا بھی جو آپ کے خون میں ہے، یہاں نہیں بنا۔ یہ **خلا میں دیو ہیکل ستاروں کے پھٹنے** سے آیا، پھر زمین پر گرا۔ اور قرآن نے یہ نہیں کہا کہ «ہم نے لوہا پیدا کیا»، کہا: **«ہم نے اتارا»**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک دھاتیں زمین کے پیٹ سے نکالی جاتی تھیں، سو وہ زمین ہی سے تھیں اور اُسی کی جنس سے۔ اور یہ تصوّر سرے سے موجود ہی نہ تھا کہ کوئی خاص دھات **اِس سیّارے کے باہر سے آئی ہو**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

ستاروں کے اندر کا جوہری ادغام عناصر کو لوہے تک بناتا ہے — پھر وہیں رُک جاتا ہے، کیونکہ لوہا جوہری قوّتِ ربط کی چوٹی ہے: اُس سے ہلکی چیزوں کا ادغام توانائی دیتا ہے، **اور اُس سے بھاری چیزوں کا بننا توانائی کھاتا ہے، دیتا نہیں**۔ سو کوئی عام ستارہ اُس سے بھاری چیز نہیں بنا سکتا۔ صرف سپرنووا (Supernova) کے دھماکے ہی لوہے کو خلا میں پھینکتے ہیں۔ اور ہمارا سیّارہ اور اُس کا سارا لوہا ستاروں کے اِسی غبار سے جمع ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قرآن نے «انزال» (اتارنے) کا فعل خاص طور پر لوہے کے ساتھ استعمال کیا، ایک ایسے سیاق میں جو رسولوں کے بھیجنے اور کتابوں کے اتارنے کی بات کر رہا ہے — یعنی اُس چیز کے سیاق میں جو **اوپر سے** آتی ہے۔ اور یہی، لفظ بہ لفظ، طبیعی حقیقت ہے۔ اِس پر یہ بھی بڑھا لیجیے کہ لوہے کا جوہری عدد 26 ہے اور کمیتی عدد 56، اور سورہ حدید مصحف کی 57ویں سورت ہے، اور رائج شمار میں یہ آیت 25 ہے۔ مگر سب سے مضبوط دلیل ایک ہی لفظ رہتا ہے: «ہم نے اتارا»۔

مآخذ Nobel Prize in Physics 1983 · Burbidge, Burbidge, Fowler & Hoyle (1957) — *Synthesis of the Elements in Stars*

دودھ پلانے کے دو مکمل سال

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس کے لیے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے

سورہ بقرہ — آیت 233

قرآن — 1400 سال پہلے	عالمی ادارۂ صحت
24 مہینے	24 مہینے
«پورے دو سال»	«دو سال یا زیادہ»
جو پورا کرنا چاہے	عالمی سطح پر مسلّمہ سفارش

وہی عدد… چودہ صدیوں کے فرق سے

عالمی ادارۂ صحت کی سفارش مدت اور اصول دونوں میں آیت سے مطابقت رکھتی ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے مکمل رضاعت کی مدت **پورے دو سال** مقرر کی۔ اور آج عالمی ادارۂ صحت بالکل یہی مدت تجویز کرتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دودھ پلانے کی مدت قوموں کے درمیان رواج اور حالات کے مطابق بہت مختلف تھی — چند مہینوں سے لے کر کئی برسوں تک — اور اِس کی کوئی سائنسی بنیاد نہ تھی۔ بچے کی نشوونما اور اُس کی قوتِ مدافعت کے لیے مثالی مدت جاننے کا کوئی ذریعہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عالمی ادارۂ صحت اور یونیسیف **چھ ماہ تک صرف ماں کا دودھ** پلانے کی سفارش کرتے ہیں، پھر اُس کے ساتھ ضمنی غذا شامل کر کے **دو سال یا اُس سے زیادہ تک** جاری رکھنے کی۔ اور ثابت ہو چکا ہے کہ ماں کا دودھ ایسے اینٹی باڈیز منتقل کرتا ہے جو بچے کی قوتِ مدافعت بناتے ہیں، شیرخوار بچوں کی اموات، انفیکشن اور ذیابیطس کم کرتا ہے، اور بہتر ذہنی نشوونما سے جڑا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

باریکی صرف عدد میں نہیں، بلکہ **اُس کے ساتھ لگی ہوئی قید** میں ہے: «اُس کے لیے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے»۔ آیت نے دو سال کو کوئی جامد فریضہ نہیں بنایا، بلکہ اُنہیں **پوری کرنے کی مستحب حد** قرار دیا — اور جدید طبی سفارش کی تعبیر عین یہی ہے («دو سال یا اُس سے زیادہ»، نہ کہ «دو سال لازماً»)۔ پھر آیت نے لچک میں مزید اضافہ کیا: والدین کی باہمی رضامندی اور مشورے سے جلد دودھ چھڑانے کی اجازت دی، اور کسی دوسری دودھ پلانے والی سے دودھ پلوانے کی اجازت دی۔ چنانچہ یہ عدد میں بھی طب سے متفق ہے اور سفارش کی روح میں بھی۔

ماخذ WHO & UNICEF — *Global Strategy for Infant and Young Child Feeding*

کھجور کا تنا اپنی طرف ہلائیے

اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلائیے، آپ پر تازہ پکی کھجوریں گریں گی۔ پس کھائیے اور پیجیے اور آنکھیں ٹھنڈی کیجیے

سورہ مریم — آیات 25–26

کھجور آج بھی حمل کے آخری ہفتوں میں اور زچگی کے بعد تجویز کی جاتی ہے

آسان لفظوں میں

ایک عورت کھجور کے نیچے تنہا بچہ جن رہی ہے، اور اُس سے کہا جاتا ہے: **تازہ کھجوریں کھائیے**۔ اور طب آج کہتی ہے کہ کھجور اُن بہترین چیزوں میں سے ہے جو عورت زچگی کے وقت اور بعد کھا سکتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تازہ کھجور ایک جانی پہچانی اور بہت پسندیدہ غذا تھی، مگر زچگی میں اُس کا کوئی متعین طبی اثر معلوم نہ تھا۔ زچہ کے لیے معمول کا مشورہ آرام، گرمی اور شوربا تھا۔ اور ٹھیک اُسی لمحے ایک خاص پھل کو چُن لینا ایک نمایاں تعیین ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مجلوں میں شائع شدہ مطالعات نے ثابت کیا ہے کہ حمل کے آخری ہفتوں میں کھجور کھانا **دردِ زہ کی مدت گھٹاتا ہے اور زچگی مصنوعی طور پر شروع کرانے کی ضرورت کم کرتا ہے**۔ کھجور میں فریکٹوز اور گلوکوز کی شکر بکثرت ہے جو تیزی سے جذب ہوتی ہے — اور ماں کو طاقت خرچ کر دینے کے بعد اِسی کی ضرورت ہوتی ہے — نیز پوٹاشیم، فولاد اور میگنیشیم۔ اور اِس میں **آکسی ٹوسن** کا کام کرنے والے مرکبات ہیں، جو رحم کو سکڑنے میں مدد دیتے اور خون بہنا کم کرتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اِس معاملے میں تین باتوں پر غور کیجیے۔ پہلی: پھل کا تعین — خاص کھجور، کوئی اور نہیں، اور یہی اِس حالت کے لیے ممکنہ بہترین غذا ہے۔ دوسری: حالت کا تعین — «**تازہ پکی کھجوریں**»، یعنی نرم اور تر کھجور، خشک نہیں؛ اور یہی جلد جذب ہوتی اور آسانی سے ہضم ہوتی ہے۔ تیسری، اور یہی سب سے عجیب ہے: **تنے کو ہلانے** کا حکم — یعنی سب سے زیادہ کمزوری کے لمحے میں عورت کو حرکت اور محنت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اور جدید طب دردِ زہ کے دوران حرکت کی سفارش کرتی ہے، کیونکہ اِس سے زچگی جلد ہوتی ہے۔ غذا، حرکت اور دل کا سکون («اور آنکھیں ٹھنڈی کیجیے») — ایک مکمل ضابطۂ علاج۔

مآخذ Guyton & Hall – oxytocin and the uterus · Al-Kuran et al. (2011) – date fruit in late pregnancy

بہتا خون اور سؤر کا گوشت کیوں حرام ہوئے؟

> کہہ دیجیے: جو وحی میرے پاس آئی ہے اُس میں کسی کھانے والے پر کوئی چیز حرام نہیں پاتا جسے وہ کھائے، سوائے اِس کے کہ وہ مُردار ہو، یا بہایا ہوا خون، یا سؤر کا گوشت — کہ یہ ناپاک ہے
>
> سورہ انعام — آیت 145

حرمت، اپنی وجہ کے معلوم ہونے سے چودہ صدیاں پہلے آ گئی

آسان لفظوں میں

قرآن نے تین چیزیں حرام کیں: بہتا ہوا خون، سؤر کا گوشت، اور وہ جانور جو خود مر گیا ہو۔ اور سائنس آج بتاتی ہے کہ اِن میں سے ہر ایک **بیماریوں کا معروف ناقل** ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

غذا کا انتخاب رواج، ذوق اور دستیابی سے ہوتا تھا۔ نہ طفیلیوں کا علم تھا، نہ جراثیم کا، نہ اِس کا کہ بیماریاں جانور سے اِنسان تک منتقل ہوتی ہیں۔ اور سؤر زمین کی بیشتر تہذیبوں میں بلا تامل کھایا جاتا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

خون جراثیم کے پھلنے کا مثالی ماحول ہے، اور گردوں کی طرف جانے والا فاسد مادہ، ہارمون اور زہریلے اجزا ساتھ لیے ہوتا ہے۔ **سؤر کا گوشت** ٹرائکینیلا کیڑے کا بڑا ناقل ہے، جو پٹھوں میں گوشہ بنا کر بیٹھتا اور ہلکی پکائی سے نہیں مرتا؛ نیز فیتہ نما کیڑے کا، جس کے لاروے دماغ تک پہنچ سکتے ہیں؛ اور ٹاکسوپلازما کا — نیز اِس میں سیر شدہ چکنائی بھی زیادہ ہے۔ **مُردار** شاید کسی بیماری یا زہر سے مرا ہو، اور اُس کا خون بافتوں ہی میں بند رہ جاتا ہے، اِس لیے جلد سڑ جاتا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

باریک قید «**بہایا ہوا**» ہے۔ حرمت ہر خون پر نہیں آئی، بلکہ اُس بہتے ہوئے خون پر جو ذبح کے وقت نکلتا ہے۔ رہا وہ جو بافتوں میں رچا بسا رہ جاتا ہے — یعنی مایوگلوبن — تو وہ معاف ہے، اور اُسے نکالنے کی سرے سے کوئی صورت بھی نہیں۔ چنانچہ یہ حرمت **ایسی سائنسی باریکی کے ساتھ مقرر ہے جو نہ کم رہتی ہے نہ حد سے بڑھتی ہے**۔ اور یہی حال ذبح کا ہے: اِس میں شرط رکھی گئی کہ رگیں کاٹی جائیں تاکہ سارا خون بہہ جائے — اور آج گوشت کی حفاظت کے معیارات اِسی کی سفارش کرتے ہیں، تاکہ جراثیم کا بوجھ کم ہو۔ ایک مکمل شریعت، جو ایسے علم سے ہم آہنگ ہے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔

ماخذ CDC — *Trichinellosis* · WHO — *Taeniasis / cysticercosis*

46 چیونٹی بولی اور خبردار کیا

یہاں تک کہ جب وہ وادیِ نمل پر پہنچے تو چیونٹی بولی: اے چیونٹیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور اُس کا لشکر تمہیں کچل نہ ڈالے

سورہ نمل — آیت 18

ایک چیونٹی اپنی بستی کو خبردار کرتی ہے اور ساری بستی بلوں میں سمٹ جاتی ہے

آسان لفظوں میں

چیونٹی نے لشکر آتا دیکھا اور چیونٹیوں کو خبردار کیا کہ گھروں میں چلی جائیں۔ اور سائنس کہتی ہے: چیونٹیاں واقعی **خطرے کا پیغام بھیجتی ہیں**، اور ساری بستی فوراً جواب دیتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدیم تصور میں جانور ایک گونگی مخلوق تھی، جس کی نہ کوئی زبان تھی نہ کوئی نظم۔ اور یہ کہ ایک چیونٹی سے ایسا جملہ نکلے جس میں **پکار، حکم، تنبیہ، وجہ اور حملہ آور کے لیے عذر** سب موجود ہوں («اور اُنہیں خبر بھی نہ ہو») — سننے والے کو یہ ایک علامتی کہانی لگتی تھی، کوئی واقعی خبر نہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

چیونٹیاں زمین کی منظم ترین سماجی مخلوقات ہیں، اور وہ تین ثابت شدہ طریقوں سے رابطہ کرتی ہیں: **کیمیائی فیرومون** — ہر پیغام کے لیے الگ مادہ ہے، اور اِنہی میں خطرے کا فیرومون ہے جو پھیلتا ہے تو ساری بستی چند سیکنڈ میں جواب دیتی ہے؛ **ٹھونگ اور ارتعاش**؛ اور **آواز** — دریافت ہوا کہ چیونٹی میں ایک عضو ہوتا ہے جسے سٹریڈیولیٹری عضو (Stridulatory organ) کہتے ہیں، جو متعین معنی والی آوازیں نکالتا ہے، اور اُنہیں لیبارٹری میں ریکارڈ کر کے پرکھا جا چکا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی دلیل ہیں۔ پہلی: فعل «**قالَت**» مؤنث کے صیغے میں آیا — اور وہ کارکن چیونٹیاں جو باہر نکلتی، پہرہ دیتی اور خبردار کرتی ہیں **سب کی سب مادہ ہیں**، جبکہ نروں کا افزائش کے سوا کوئی کام نہیں، پھر وہ مر جاتے ہیں۔ دوسری: «**اپنے گھروں**» میں داخل ہونے کا حکم — اور چیونٹیوں کے بل واقعی گھر ہیں، جو کمروں، سرنگوں اور گوداموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ تیسری: «کہیں وہ تمہیں کچل نہ ڈالیں» — عربی کا یہ لفظ توڑنے کے معنی میں ہے، اور چیونٹی کا جسم ایک سخت بیرونی ڈھانچہ ہے جو **ٹوٹتا ہے، پچکتا نہیں**۔ ایک ہی آیت میں تین باریکیاں۔

مآخذ Hölldobler & Wilson — *The Ants*, 1990 · Ant communication — pheromones and stridulation

تین سو برس، اور نو مزید

اور وہ اپنے غار میں تین سو برس رہے، اور نو اور بڑھ گئے

سورہ کہف — آیت 25

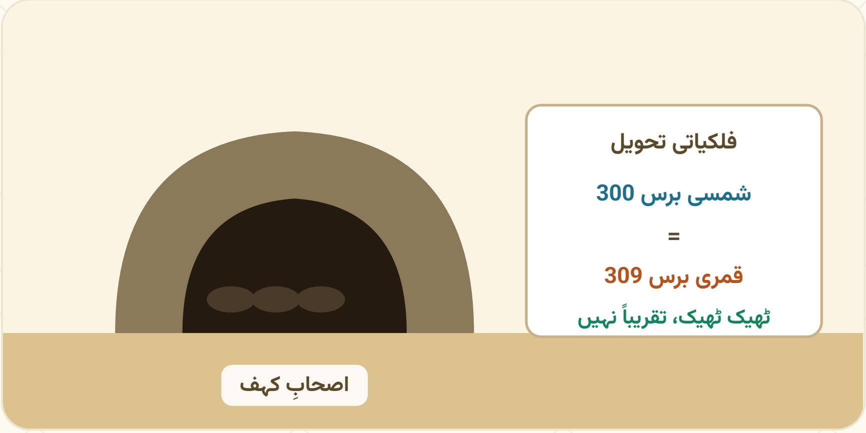

تین صدیوں پر دونوں تقویموں کا فرق صحیح گنتی میں ٹھیک نو برس بنتا ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے کہا کہ وہ **تین سو برس** رہے، پھر بڑھایا: **«اور نو اور بڑھ گئے»**۔ اور سبب نہایت لطیف ہے: تین سو شمسی برس 309.2 قمری برس کے برابر ہیں — یعنی صحیح گنتی میں تین سو نو۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ ہر علاقے میں ایک ہی تقویم استعمال کرتے تھے، اور دو تقویموں کے درمیان تبدیلی نہیں کرتے تھے۔ اور ایک گول عدد کے بعد «نو» کا اضافہ ایک عجیب اور بے معنی زیادتی لگتا تھا، یہاں تک کہ بعض پڑھنے والوں نے اسے عدد میں تردد سمجھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شمسی سال 365.2422 دن کا ہے، اور قمری سال 354.367 دن کا۔ تو تین سو شمسی برس = 109572.6 دن ہوئے۔ اور اگر اسے قمری سال کی لمبائی پر تقسیم کیا جائے تو **309.2** قمری برس نکلتے ہیں۔ یعنی فرق صحیح گنتی میں نو برس ہے۔ اور اصحابِ کہف ایک رومی ماحول میں تھے جو شمسی تقویم استعمال کرتا تھا، جبکہ قرآن ایسے لوگوں سے خطاب کرتا ہے جو قمری تقویم استعمال کرتے ہیں — سو اس نے عدد دونوں تقویموں میں ایک ساتھ دے دیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اگر عدد یونہی بے قاعدہ ہوتا تو «تین سو برس» کہہ کر رک جاتا، یا «تین سو اور کچھ» کہہ دیتا۔ لیکن اضافہ **ٹھیک نو کے ساتھ متعین** آیا — اور وہی بعینہٖ فلکی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ اور صیغے پر غور کیجیے: «تین سو برس **اور نو اور بڑھ گئے**» — فعل «بڑھ گئے» بتاتا ہے کہ یہ نو کوئی اور مدت نہیں جو انھوں نے گزاری ہو، بلکہ **گنتی میں اضافہ ہے، زمانے میں نہیں** — یعنی زمانہ ایک ہی ہے اور عدد تقویم کے بدلنے سے بدل گیا۔ اور یہی واحد تفسیر ہے جو حساب اور زبان، دونوں کے اعتبار سے درست بیٹھتی ہے۔

ماخذ U.S. Naval Observatory — *Explanatory Supplement to the Astronomical Almanac*

ثمود، جنھوں نے پہاڑ تراش کر گھر بنائے

اور تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو، بڑی مہارت سے ۞ … ۞ اور وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے، بے خوف ہو کر

سورہ شعراء 149 — اور سورہ حجر 82

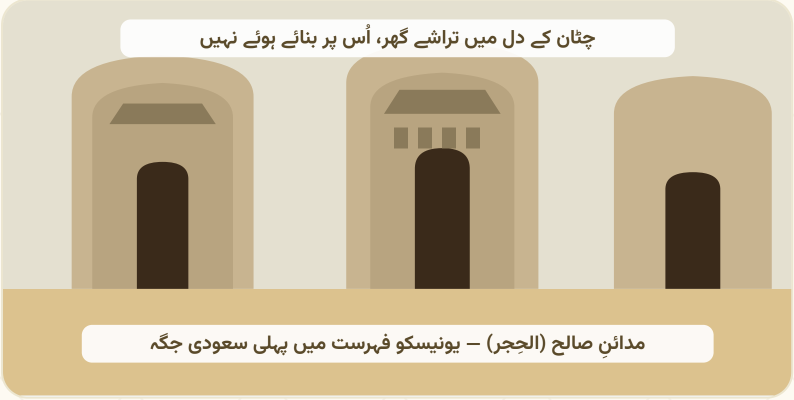

چٹان کے اوپر سے نیچے تک تراشے گئے بہت بڑے رُخ — ایک بھی غلطی برداشت نہیں کرتے

آسان لفظوں میں

قرآن نے کہا کہ قومِ ثمود **اپنے گھر پہاڑوں کے اندر تراشتے تھے** — پتھر سے بناتے نہیں تھے، بلکہ خود پہاڑ کو کھود کر اُسی سے گھر بناتے تھے۔ اور یہ گھر آج بھی موجود ہیں اور زائرین اُنھیں دیکھتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جزیرۂ عرب میں معروف تعمیر مٹی، پتھر اور کھجور کی شاخوں کی تھی۔ اور ایک پوری تہذیب کا اپنے مسکن پہاڑوں کے پیٹ میں تراشنا سننے والوں کے لیے اجنبی بات تھی۔ اور قرآن نے ایک ایسی متعیّن قوم کا نام لیا جس کا تورات میں کوئی ذکر نہیں، اور جسے قدیم مصادر — سرگون کے سالناموں سے لے کر دیودورس اور بطلیموس تک — شمالی جزیرۂ عرب کے ایک عربی قبیلے کے نام کے سوا نہیں جانتے تھے، اور کسی نے اُس کی طرف یہ تعمیری تکنیک منسوب نہیں کی تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مدائنِ صالح (الحِجر)، شمالی سعودی عرب کے العُلا میں: ریتلی چٹان میں تراشے گئے 130 سے زیادہ رُخ، جن میں سے کچھ بیس میٹر سے اونچے ہیں، ستونوں، تاجوں، کنگروں اور ثمودی و نبطی نقوش کے ساتھ۔ اور یہ 2008 میں یونیسکو کی عالمی ورثہ فہرست میں پہلی سعودی جگہ کے طور پر درج ہوا۔ اور یہ مقام قرآن میں اپنے نام کے ساتھ مذکور ہے: «اور بے شک **حِجر والوں** نے رسولوں کو جھٹلایا»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ کن وہ فعل ہے جو استعمال ہوا: «**تراشتے ہیں**»، نہ کہ «بناتے ہیں»۔ اور عربی میں «نَحت» ٹھوس چٹان میں سے مادہ نکالنا ہے، اور یہ تعمیر کے بالکل اُلٹ ہے۔ پھر تخصیص: «**پہاڑوں میں سے**» — یعنی خود پہاڑ ہی گھر کا مادہ ہے۔ اور یہ ایک ایسی تکنیک کا باریک بیان ہے جو سننے والوں کے گرد کسی چیز سے مشابہ نہ تھی۔ اور ایک نہایت بامعنی نفسیاتی وصف بھی بڑھایا: «**بے خوف**» — کہ یہ گھر نہ گرتے ہیں، نہ جلتے ہیں، نہ کوئی دشمن اُنھیں ڈھا سکتا ہے، کیونکہ وہ خود چٹان ہیں۔ اور اِسی سے آیت کا مفہوم اور تیز ہو جاتا ہے: سب سے بڑی تعمیری حفاظت اُن کے کچھ کام نہ آئی۔

مآخذ [UNESCO World Heritage List – Hegra (al-Hijr)]

اصحابِ اُخدود… آگ کی خندق کھودنے والے

> ھلاک کیے گئے خندق والے ۝ اُس آگ والے جس میں خوب ایندھن تھا ۝ جب وہ اُس کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے ۝ اور جو کچھ وہ مومنوں کے ساتھ کر رہے تھے اُس پر گواہ تھے
>
> سورہ بروج — آیات 7-4

ایک تاریخی قتلِ عام جو یمنی کتبوں میں اور اُسی زمانے کے سریانی خطوط میں درج ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے ایسی قوم کا ذکر کیا جس نے **ایک لمبی خندق** کھودی اور اُس میں آگ جلائی، پھر مومنوں کو اُس میں ڈالا اور بیٹھ کر دیکھتے رہے۔ اور یہ حقیقی تاریخی واقعہ ہے جو پتھر کے کتبوں میں درج ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ واقعہ عربوں کی کتابوں میں کسی قابلِ اعتماد تفصیل کے ساتھ مذکور نہ تھا، نہ مکہ میں اُس کی کوئی لکھی ہوئی سند دستیاب تھی۔ اور یہ ایک دوسری اُمت، پہلے زمانے اور دور کی سرزمین کا قصہ ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

تاریخ تقریباً 523 عیسوی کے **نجران** کے قتلِ عام کو ثابت کرتی ہے، جب حِمیَری بادشاہ **ذُو نُواس** نے نجران کے نصاریٰ پر ظلم کیا اور جس نے اپنے دین سے پھرنے سے انکار کیا اُسے جلا دیا۔ اور یہ واقعہ اِن میں درج ہے: **حصنِ غُراب کا کتبہ**، اور واقعے کے ہم عصر **شمعون الارشامی کا سریانی خط**، اور بازنطینی و حبشی مصادر۔ اور نجران کے شمال میں بئرِ حِمیٰ میں 633 حِمیَری سن کے تین کتبے دریافت ہوئے، جو مقتولوں کو بارہ ہزار اور چودہ ہزار کے درمیان، اور قیدیوں کو ساڑھے نو ہزار اور گیارہ ہزار کے درمیان شمار کرتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

فیصلہ چھوٹی تفصیلوں کی باریکی کرتی ہے۔ عربی میں «**اُخدود**» زمین میں لمبا سیدھا شگاف ہے — گول گڑھا نہیں۔ اور یہ کھودی ہوئی خندقوں کے وصف کے عین مطابق ہے۔ اور «**جس میں خوب ایندھن تھا**» یہ بتاتا ہے کہ اُس آگ کو تازہ ایندھن پہنچایا جاتا رہا، وہ کوئی اتفاقی آگ نہ تھی۔ اور «**اُس کے کنارے بیٹھے ہوئے**» اور «**گواہ**»: یعنی مجرم بیٹھ کر دیکھ رہے تھے — اور یہ ایسی تفصیل ہے جو شمعون کے خط میں آنے والی اِس بات کے عین مطابق ہے کہ بادشاہ خود سزا کے نفاذ میں حاضر تھا۔ اور غور کیجیے کہ قرآن نے نہ بادشاہ کا نام لیا نہ قوم کا — کیونکہ مقصود عبرت ہے، قصہ گوئی نہیں۔

مآخذ The Book of the Himyarites — the Najrān persecution, c. 523 CE · The Himyarite Kingdom of south Arabia

50

سبا اور بند کا ٹوٹنا

پھر انہوں نے منہ موڑ لیا تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا، اور ہم نے ان کے دو باغوں کے بدلے دو ایسے باغ دے دیے جن میں بدمزہ پھل اور جھاؤ تھا

سورہ سبا — آیت 16

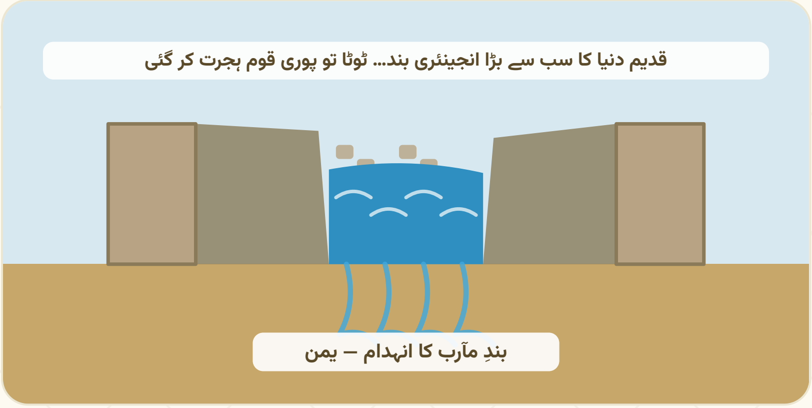

اس دیوہیکل بند کے آثار آج بھی مآرب میں قائم ہیں

آسان لفظوں میں

یمن میں ایک مالدار سلطنت تھی جس کا نام **سبا** تھا، جو ایک عظیم بند کے سہارے جیتی تھی جو اس کے باغ سیراب کرتا تھا۔ پھر بند ٹوٹ گیا، اور سیلاب ہر چیز بہا لے گیا، اور باغ ایسے کڑوے درختوں میں بدل گئے جو کھائے نہیں جاتے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

سبا عربوں کی یادداشت میں شعر اور ضرب المثل کا ایک نام تھا — «تفرقوا ایدی سبا»۔ لیکن نہ کوئی کھدے ہوئے آثار تھے اور نہ پڑھے جانے والے کتبے۔ اور مغربی مؤرخین تو اس سلطنت کے سرے سے وجود ہی میں شک کرتے تھے اور اسے آدھی داستان شمار کرتے تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بندِ مآرب آج ایک قائم نشانی ہے: تقریباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں بنا، لمبائی قریباً 600 میٹر، اور تقریباً دس ہزار ہیکٹر زمین کو سیراب کرتا تھا۔ اور اس کے ٹوٹنے کے واقعات **سبائی مسند کتبوں** میں درج ہیں جو اسی مقام سے ملے ہیں — انھی میں ابرہہ کا وہ مشہور کتبہ ہے جو 548ء میں بند کی مرمت بیان کرتا ہے۔ اور آخری انہدام تقریباً 570-580ء میں ہوا، جس سے **پورے یمنی قبیلوں کی ہجرت** شمال کی طرف ہوئی — اور یہ ہجرت عربوں کے انساب اور تاریخ میں معروف ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے صرف انہدام کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد زمین کے ساتھ جو کچھ ہوا، اسے نباتاتی باریکی کے ساتھ بیان کیا: «دو باغ جن میں **بدمزہ پھل اور جھاؤ اور کچھ تھوڑی سی بیریاں**»۔ اور خمط کانٹے دار کڑوا درخت ہے، اور اثل جھاؤ کی ایک قسم، اور سدر بیری کا درخت — اور بالکل یہی **خشک نمکین ماحول کے پودے** ہیں جو آبپاشی رک جانے اور مٹی کے کھاری ہو جانے پر کھیتی کی جگہ لے لیتے ہیں۔ پھر فرمایا: «اور کچھ **تھوڑی سی** بیریاں» — ٹھیک اپنے مقام پر تقلیل، کیونکہ بیری ان تینوں میں سب سے زیادہ نفع بخش اور سب سے کم ہے۔

مآخذ The Ma'rib Dam and its Sabaean inscriptions · Abraha — the dam-repair inscription (CIH 541)

51

فرعون کا بدن... نشانی بننے کو محفوظ

سو آج ہم تجھے تیرے بدن کے ساتھ بچا لیں گے، تاکہ تُو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی بنے

سورہ یونس — آیت 92

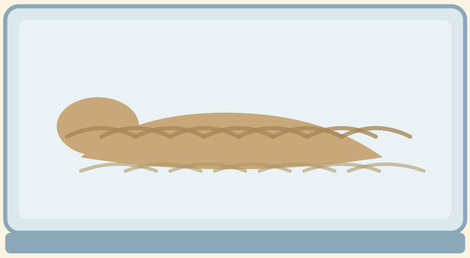

فرعون کا جسم آج شیشے کے پیچھے رکھا ہے، جہاں لوگ اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں

آسان لفظوں میں

جب فرعون سمندر میں غرق ہوا تو اللہ نے فرمایا کہ وہ اُس کا **جسم** محفوظ رکھے گا تاکہ بعد میں آنے والے اُسے دیکھیں اور عبرت پکڑیں۔ اور وہ جسم آج ایک عجائب گھر میں موجود ہے جسے ساری دنیا کے لوگ دیکھنے آتے ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جو سمندر میں ڈوبتا ہے اُس کا جسم چلا جاتا ہے: مچھلیاں کھا جاتی ہیں، یا گل سڑ جاتا ہے، یا ریت میں گم ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ آیت اُتری تو عربوں میں سے کوئی شاہی حنوط کاری کے بارے میں کچھ نہ جانتا تھا، نہ فراعنہ کی قبروں کا۔ بلکہ خود ہیروغلیفی زبان بالکل بھلا دی گئی تھی، اور اُس کے رموز 1822 سے پہلے حل نہ ہوئے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شاہی ممیوں کا ذخیرہ 1881 میں دیر البحری میں دریافت ہوا، پھر 1898 میں امنحتب دوم کی قبر، تو مملکتِ جدیدہ کے فراعنہ کے جسم سامنے آئے۔ اور **مرنپتاح** کا جسم — جو خروج کے فرعون کے اُمیدواروں میں سے ایک ہے، اگرچہ اکثر محققین رعمسیس دوم کے قائل ہیں — قاہرہ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اور ماہرِ تشریح گرافٹن ایلیٹ سمتھ نے 1907 میں اُس کے کفن کھولے اور ایک بوڑھے آدمی کے جسم کا بیان کیا جو حنوط کاری سے پورا کا پورا محفوظ رہا — اور وہ آج شیشے کے پیچھے رکھا ہے، جہاں زائرین اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے صرف «ہم تجھے بچا لیں گے» نہیں کہا، بلکہ خاص کیا: «**تیرے بدن کے ساتھ**» — یعنی روح کے بغیر صرف جسم۔ اور یہ ایک باریک امتیاز ہے جو کسی شخص کے بچنے اور اُس کی لاش کے باقی رہ جانے میں فرق کرتا ہے۔ پھر اِس کی علت بتائی: «**تاکہ تُو اپنے بعد آنے والوں کے لیے نشانی بنے**» — یعنی خود جسم کا باقی رہنا ہی مقصود ہے، وہ دیکھے جانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک ایسے صحرا میں اُتری جس کے باشندوں کو نہ ممیوں کا علم تھا نہ قبروں کا، اور اُن قبروں کے کھلنے اور اُن کے مکینوں کے شیشے کے ہالوں میں رکھے جانے سے بارہ سو سال پہلے۔

مآخذ [The Royal Mummies, Cairo](#) · [Champollion — decipherment of hieroglyphs, 1822](#) · [The Deir el-Bahari royal cache (TT320), 1881](#)

52

وہ مخطوطات جن کی گواہی کاربن نے دی

بے شک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے، اور بے شک ہم ہی اس کے نگہبان ہیں

سورہ حجر — آیت 9

مخطوطۂ برمنگھم

کاربن 14 سے تاریخ کاری

568 – 645ء

احتمال کے ساتھ 95%

اس کا متن آج کے مصحف کے مطابق ہے

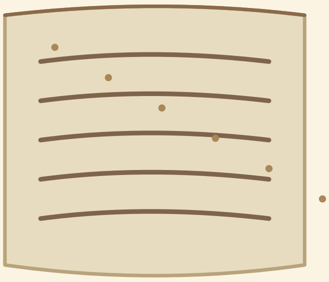

برمنگھم یونیورسٹی — برطانیہ

نبی ﷺ کی زندگی کا، یا اس کے فوراً بعد کا چمڑے کا ایک ورق — اور اس کا متن آج ہی کا متن ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے یہ ذمہ لیا کہ وہ محفوظ رہے گا، بدلے گا نہیں۔ اور آج ہمارے پاس **تابکار کاربن سے تاریخ شدہ مخطوطات** ہیں جو تقریباً نبی ﷺ کے زمانے تک پہنچتے ہیں — اور ان کا متن وہی ہے جو اس مصحف کا ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے، حرف بہ حرف۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

تمام قدیم کتابیں نقل اور ترجمے کے دوران کمی، زیادتی اور تبدیلی کا شکار ہوتی ہیں۔ اور یہ ہر اس متن کا فطری انجام ہے جو صدیوں ہاتھ سے منتقل ہوتا رہے۔ چنانچہ کامل حفاظت کا دعویٰ **ایسا دعویٰ تھا جسے کوئی ایک بھی مختلف مخطوطہ جھٹلا سکتا تھا**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مخطوطۂ برمنگھم: چمڑے کا ایک ورق جس کی جانچ 2015 میں جامعہ آکسفورڈ میں کاربن 14 سے کی گئی، تو اس کی تاریخ **568 اور 645ء** کے درمیان نکلی، 95% احتمال کے ساتھ۔ اور مخطوطۂ صنعا (اس کا بالائی عثمانی متن)، اور مخطوطۂ توبنگن، اور مخطوطۂ سمرقند، اور استنبول اور قاہرہ کے بڑے مصاحف۔ اور محققین نے — مسلمان اور غیر مسلم دونوں — ان مخطوطات کا آج رائج مصحف سے موازنہ کیا، تو متن میں مطابقت تقریباً کامل تھی، سوائے حروف کی رسم میں املا کے چند فرق کے، جو نہ لفظ بدلتے ہیں نہ معنیٰ۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حفاظت اکیلے مخطوطات پر قائم نہیں رہی، بلکہ **ایک ایسے دوہرے نظام پر جو انسانی تاریخ میں بے مثال ہے**: چھان پھٹک کے ساتھ کتابت، اور **تواتر کے ساتھ سینوں میں حفظ**۔ اور ہر نسل میں اسے لاکھوں لوگ دور دراز ملکوں میں یاد کیے ہوئے ہوتے ہیں، جنہیں کوئی ایک حکومت جمع نہیں کرتی، سو یہ عملاً ناممکن ہے کہ وہ ایک حرف بدلنے پر متفق ہو جائیں۔ اور خود متن نے **یہ ذمہ اس وقت اعلان کیا جب وہ سب سے کمزور حال میں تھا** — مکہ میں ایک ستائی ہوئی جماعت۔ کسی متن کا چودہ صدیاں اس طرح قائم رہنا کہ دو مختلف نسخے تک نہ ہوں، روئے زمین کی کسی اور کتاب میں اس کی نظیر نہیں۔

مآخذ University of Birmingham — the Mingana Qur'ān folios · Oxford Radiocarbon Accelerator Unit

تم ضرور مسجدِ حرام میں امن کے ساتھ داخل ہو گے

> بے شک اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا، حق کے ساتھ: تم ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہو گے، اگر اللہ نے چاہا، امن کے ساتھ، اپنے سر منڈواتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے، بے خوف
>
> سورہ فتح — آیت 27

امن کے ساتھ داخلے کا وعدہ... روکے جانے کے سخت ترین لمحے میں

آسان لفظوں میں

مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا گیا، اور وہ راستے ہی سے ٹوٹے دلوں کے ساتھ لوٹ آئے۔ تب ایک آیت نازل ہوئی جو انہیں وعدہ دیتی تھی کہ وہ **بیت اللہ میں امن کے ساتھ داخل ہوں گے**۔ دو برس بعد وہ بغیر لڑائی اور بغیر خوف کے مکہ میں فاتح بن کر داخل ہوئے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

6 ہجری میں، حدیبیہ کے مقام پر، مسلمانوں کو بیت اللہ سے لوٹا دیا گیا اور انہوں نے قریش سے ایسی شرطوں پر صلح کی جنہیں ان میں سے بہتوں نے زیادتی سمجھا، یہاں تک کہ عمر نے کہا: «ہم اپنے دین میں یہ ذلت کیوں قبول کریں؟»۔ اور مکہ اپنی قوت کے عروج پر تھا، اور مسلمان تعداد اور سامان دونوں میں کم۔ اور افق پر ایسی کوئی چیز نہ تھی جو کسی قریبی فتح کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

8 ہجری (630ء) میں نبی ﷺ دس ہزار کے سر پر مکہ میں داخل ہوئے، **بغیر کسی قابلِ ذکر معرکے کے**، اور عام معافی کا اعلان کیا: «جاؤ، تم سب آزاد ہو»۔ اور مسلمانوں نے امن کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا، اور سر منڈوائے اور بال کترائے۔ اور یہ اسلامی تاریخ کے سب سے زیادہ مستند واقعات میں سے ہے، اور تمام مآخذ اس پر متفق ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات ہی اسے امید سے اٹھا کر پیش گوئی بناتی ہیں۔ اس نے صرف اتنا نہیں کہا کہ «تم مکہ فتح کر لو گے»، بلکہ **داخلے کی کیفیت** بھی متعین کی: «**امن کے ساتھ**» — نہ کہ کسی خونریز جنگ کے بعد فاتح بن کر؛ اور «**بے خوف**» — مکمل امن کی تاکید؛ اور «**اپنے سر منڈواتے ہوئے اور بال کتراتے ہوئے**» — یعنی وہ اطمینان کے ساتھ پورا نسک ادا کریں گے، اور یہ شہر پر مکمل قابو کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ہی جملے میں چار تفصیلات، اور چاروں پوری ہوئیں۔

ایک وادی جس میں کھیتی نہ تھی... آج زمین کا سب سے پُرہجوم مقام

> اے ہمارے رب! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے کھیتی وادی میں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسا دیا ... سو لوگوں میں سے کچھ دلوں کو ایسا کر دے کہ اُن کی طرف جھک پڑیں، اور اُنہیں پھلوں سے روزی دے
>
> **سورہ ابراہیم — آیت 37**

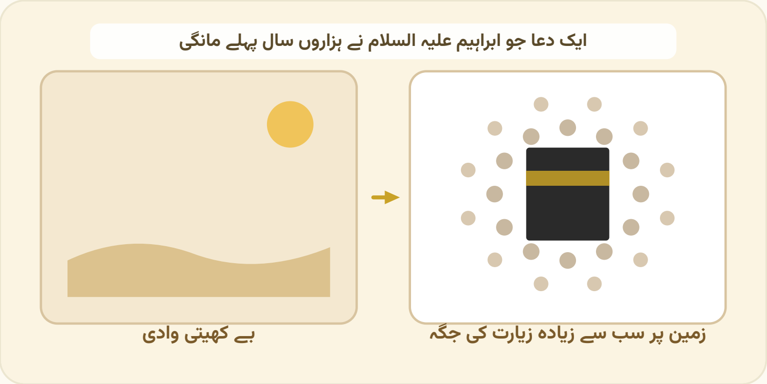

ایسی زمین جو کچھ نہیں اُگاتی... اور اُس میں ساری دنیا کے پھل ملتے ہیں

آسان لفظوں میں

ابراہیم علیہ السلام نے، جب وہ اپنی بیوی اور بچے کو ایک ایسی وادی میں چھوڑ رہے تھے جہاں **نہ پانی تھا نہ کھیتی**، یہ دعا کی کہ اللہ لوگوں کے دل اُن کی طرف مشتاق کر دے اور اُنہیں پھلوں کی روزی دے۔ اور یہی وادی آج **روئے زمین پر سب سے زیادہ لوگوں کی منزل** ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

وہ وادی بنجر پہاڑوں کے بیچ ایک ننگا صحرا تھی؛ نہ دریا، نہ چشمہ، اور اُس زمانے میں نہ کوئی تجارتی راستہ۔ اُس میں کچھ نہ تھا جو کسی کو اپنی طرف بلائے۔ اور خود یہ دعا اپنے اندازِ بیان میں عجیب ہے: نہ کھیتی مانگی نہ زمین کے لیے پانی، بلکہ دو الگ چیزیں مانگیں: **دل جو جھک پڑیں**، اور **پھل جو روزی بنیں**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

آج مکہ: صرف حج کے موسم میں بیس لاکھ سے زیادہ لوگ چند دنوں میں وہاں پہنچتے ہیں، اور لاکھوں سال بھر عمرہ کرتے ہیں۔ اور ایک ارب اسّی کروڑ سے زیادہ انسانوں کے چہرے **دن میں پانچ بار** اُسی کی طرف اُٹھتے ہیں۔ اور اُس کی زمین نہیں بدلی: وہ آج بھی بے کھیتی وادی ہے۔ اِس کے باوجود اُس کے بازاروں میں آپ کو ساری زمین کے پھل ملتے ہیں، جو سال بھر ہر براعظم سے آتے ہیں۔ اور زمزم کا کنواں چار ہزار سال سے صحرا کے دل میں بہہ رہا ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز **خود اِس دعا کی ساخت** میں ہے۔ فطری بات یہ تھی کہ جو شخص اپنے گھر والوں کو صحرا میں چھوڑ رہا ہو، وہ زمین کے سرسبز ہونے یا بارش برسنے کی دعا کرتا۔ مگر اُنہوں نے یہ دعا کی کہ **لوگوں کے دل اُن کی طرف جھک پڑیں** — یعنی روزی زمین سے نہیں، لوگوں کے ہاتھوں آئے۔ اور باریکی یہ کہ کہا «**لوگوں میں سے کچھ دل**»، نہ «سب لوگ» — کہ اگر سب مانگ لیتے تو وہ جگہ اُنہیں سما نہ سکتی۔ پھر کہا «**جھک پڑیں**»، نہ «آئیں» — اور جھک پڑنا شوق اور کشش سے گرنا ہے، مجبور ہو کر آنا نہیں۔ اور یہ ٹھیک اُس آدمی کے حال کا بیان ہے جو کعبہ کو پہلی بار دیکھتا ہے۔ اِتنی باریکی سے کہی گئی ایک دعا، پھر چار ہزار سال تک حرف بہ حرف پوری ہوتی رہی۔

کسریٰ کے دو کنگن سراقہ کے ہاتھوں میں

آپ نے سراقہ بن مالک سے فرمایا: تمہارا کیا حال ہو گا جب تم کسریٰ کے دو کنگن پہنو گے؟

اسے بیہقی، ابن عبدالبر اور دوسروں نے روایت کیا

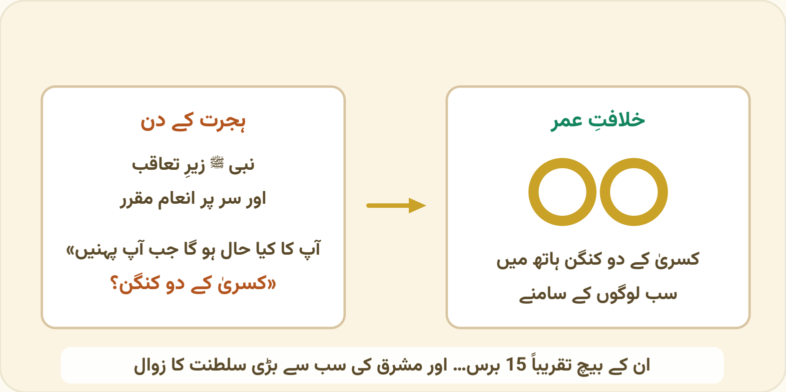

ایک آدمی جو سو اونٹوں کے لالچ میں آپ کو قتل کرنے نکلا… اسے کسریٰ کے خزانوں کا وعدہ ملا

آسان لفظوں میں

سراقہ ہجرت کے دن انعام کے لالچ میں نبی ﷺ کا پیچھا کرنے نکلے۔ تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: **تمہارا کیا حال ہو گا جب تم فارس کے بادشاہ کے دو کنگن پہنو گے؟** اور برسوں بعد انہوں نے واقعی عمر بن خطاب کی خلافت میں وہ پہنے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

جس لمحے یہ بات کہی گئی، وہ **پوری سیرت کا سب سے نازک لمحہ ہے**: نبی ﷺ اپنے شہر سے نکلے ہوئے، پیچھا کیے جاتے ہوئے، اپنی سواری اور اپنے ساتھی کے سوا کچھ نہ رکھتے ہوئے، اور آپ کے سر پر سو اونٹ مقرر تھے اس کے لیے جو آپ کو پکڑ لائے۔ اور فارس اس دن روئے زمین کی دو سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک تھا، اور کسریٰ نبی ﷺ کا خط مذاق اڑاتے ہوئے پھاڑ رہا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

عمر بن خطاب کی خلافت میں ساسانی سلطنت گر گئی اور مدائن فتح ہوا، اور کسریٰ کے خزانے مدینہ لائے گئے۔ تو عمر نے سراقہ بن مالک کو بلایا اور انہیں **کسریٰ کے دو کنگن، اس کا تاج اور اس کی پیٹی** پہنائی، اور ان سے کہا: «کہیے: تمام تعریف اس اللہ کے لیے جس نے یہ کسریٰ بن ہرمز سے چھین کر بنو مدلج کے ایک بدوی سراقہ بن مالک کو پہنا دیے»۔ اور یہ خبر حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں متعدد سندوں سے مروی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہ پیش گوئی تین ایسی چیزیں جمع کرتی ہے جن کا اندازے سے جمع ہونا ناممکن ہے: **ایک متعین شخص نام کے ساتھ** (سراقہ)، اور **ایک متعین چیز بعینہ** (کسریٰ کے دو کنگن، نہ کہ کوئی بھی مالِ غنیمت)، اور **ایک زبردست سیاسی واقعہ** (فارس کا گرنا اور اس کے خزانوں کا عربوں تک پہنچنا)۔ اور یہ ایسے آدمی سے کہی گئی جو اس لمحے **پیچھا کرنے والا دشمن** تھا، نہ کہ خوشخبری پانے والا کوئی ساتھی۔ اور اگر مقصود دل جیتنا ہوتا تو چھوٹے سے چھوٹا وعدہ زیادہ کارآمد ہوتا۔ رہا یہ کہ ایک پیچھا کیا جانے والا آدمی، جو اس دن اپنی جان کے سوا کچھ نہ رکھتا تھا، اپنے تعاقب کرنے والے سے سب سے بڑی سلطنت کے خزانوں کا وعدہ کرے — تو یہ اس کی بات ہے جسے اپنے ماخذ پر پورا یقین ہے، اور وہ ماخذ انسانی نہیں۔

ماخذ [الطبري — «تاريخُ الرُّسلِ والمُلوك»]

56

وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے

اُس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔

سورہ زُمر — آیت 5

رات اور دن زمین کے کرّے کے گِرد لپٹتے ہیں، ایسی گردش میں جو کبھی نہیں رُکتی

آسان لفظوں میں

لفظ «یُکَوِّر» «کُرہ» سے نکلا ہے اور «عمامہ لپیٹنے» سے — یعنی **کسی گول چیز پر کسی چیز کا لپیٹا جانا**۔ سو رات زمین کو یوں لپیٹتی ہے جیسے عمامہ سر کو لپیٹتا ہے۔ اور لپیٹ گول جسم ہی پر ہوتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ہر جگہ عام لوگوں میں یہی مشہور تھا کہ زمین ایک پھیلی ہوئی سطح ہے، اور رات دن کی **جگہ لے لیتی ہے** اور اُسے مٹا دیتی ہے۔ یونانی فلسفیوں میں سے جنھوں نے زمین کو گول کہا، اُنھوں نے بھی اِسے رات اور دن کی حد کی مسلسل لپیٹتی حرکت سے نہ جوڑا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زمین ایک کرّہ ہے (دونوں قطبوں پر ذرا چپٹا)، اور سورج ہمیشہ اُس کے آدھے حصّے کو روشن رکھتا ہے۔ زمین کا اپنے گِرد گھومنا **رات اور دن کے درمیان کی حد** کو اُس کی سطح پر بغیر رُکے سرکاتا رہتا ہے — یعنی رات لفظاً کرّے کے گِرد لپٹتی ہے، مٹتی نہیں بلکہ آگے بڑھتی ہے۔ اور یہ آپ اپنی آنکھ سے زمین کی کسی بھی زندہ سیّارہ تصویر میں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

رات اور دن کے پے در پے آنے کو بیان کرنے کے لیے «کُرہ» کے مادّے سے فعل چُننا کسی ہموار سطح پر معنیٰ نہیں رکھتا۔ اور اِس سے بھی باریک بات یہ ہے: آیت اِس لپیٹ کو **دونوں طرف سے باہم** بناتی ہے — «وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے» — اور ایسا وہی بیان کر سکتا ہے جو کسی گول جسم پر مسلسل گردش دیکھ رہا ہو۔ اور ایک دوسری جگہ: «اور اُس کے بعد زمین کو **دَحا** کیا» — اور عربی میں دَحو کا معنیٰ پھیلانا، بچھانا اور ہموار کرنا ہے، یعنی سطح کو بسنے کے قابل بنانے کا بیان۔ گولائی پر دلالت کا اصل سہارا «یُکَوِّر» ہی ہے، «دَحا» نہیں؛ کیونکہ مادّۂ کُرہ سے صرف وہی نکلا ہے۔

مآخذ [NASA Earth Observatory — the day–night terminator]

لوٹانے والا آسمان

قسم ہے آسمان کی جو لوٹاتا ہے

سورہ الطارق — آیت 11

پانی بھاپ بن کر چڑھتا ہے اور بارش بن کر لوٹتا ہے — ایک بند چکر جس سے کچھ ضائع نہیں ہوتا

آسان لفظوں میں

آسمان سمندر سے پانی بھاپ بنا کر لیتا ہے، پھر اُسے بارش بنا کر ہماری طرف **لوٹاتا** ہے۔ آج آپ جو قطرہ پیتے ہیں وہ آپ سے پہلے کسی نے پیا تھا، اور آپ کے بعد کوئی پیے گا۔ پانی ختم نہیں ہوتا، لوٹتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش کو **نیا** پانی سمجھا جاتا تھا جو اللہ آسمان کے خزانوں سے اُتارتا ہے، نہ کہ خود زمین سے لوٹنے والا پانی۔ ارسطو نے بھاپ کے چڑھنے اور بارش بن کر لوٹنے کا ذکر کیا، مگر وہ بےپیمائش نظری بات رہی؛ اور پانی کا چکر ایک ایسے بند نظام کے طور پر جس میں بارش دریاؤں کا بہاؤ پورا کرتی ہے، سترہویں صدی سے پہلے ثابت نہ ہوا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پانی کا چکر: آبی سطحوں سے بخارات ← بادل میں تکثیف ← بارش ← بہاؤ ← پھر بخارات۔ زمین پر پانی کی مقدار **اربوں برس سے ثابت ہے**، گھومتی رہتی ہے، نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی۔ اور فضا صرف پانی ہی نہیں لوٹاتی، بلکہ حرارت اور ریڈیو لہریں بھی لوٹاتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

ایک ہی لفظ «الرَّجْع» پورا مفہوم اُٹھائے ہوئے ہے۔ رجع کے معنی ہیں **کسی چیز کا اپنی جگہ لوٹ آنا**، محض اُترنا نہیں۔ تو آسمان کو یہ صفت دینا اِس کا اعلان ہے کہ جو اُس سے اُترتا ہے وہ پہلے اُسی کی طرف چڑھا تھا۔ یہ دو لفظوں میں پانی کے پورے چکر کا خلاصہ ہے۔ اور دوسری جگہ اِس کی تائید ہے: «اور ہم نے آسمان سے **ایک اندازے کے ساتھ** پانی اُتارا» — یعنی ایک مقرر اور ثابت مقدار جو بدلتی نہیں۔

ماخذ U.S. Geological Survey — *The Water Cycle* · The ionosphere and the reflection of radio waves

ایک اندازے سے پانی... نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے

> اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے سے پانی اتارا، پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیا۔ اور بےشک ہم اسے لے جانے پر بھی قادر ہیں
>
> سورہ المؤمنون — آیت 18

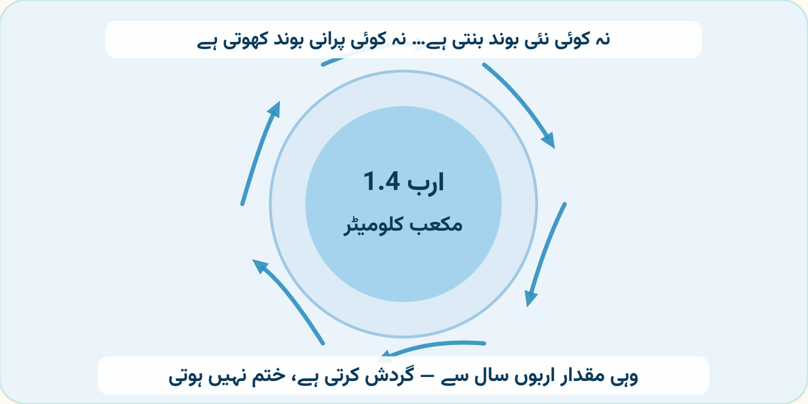

پورے سیّارے کی سطح پر ایک ثابت آبی میزان

آسان لفظوں میں

زمین پر پانی کی مقدار **ثابت ہے: نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے**۔ جو پانی ڈائنوسار نے پیا تھا وہی پانی آج آپ پیتے ہیں۔ اور آیت میں «**بِقَدَر**» کا مطلب ہے: ایک شمار کی ہوئی، ٹھیک ٹھیک مقدار میں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بارش کو یوں سمجھا جاتا تھا کہ یہ نیا پانی ہے جو آسمان کے خزانوں سے اُس وقت اتارا جاتا ہے جب لوگوں کو ضرورت ہو۔ اور **ایک بند، ثابت مقدار کے گردش کرنے** کا تصور کسی ثقافت میں موجود نہ تھا۔ ظاہری بات تو یہی ہے کہ سمندر کا پانی بھاپ بن کر کم ہوتا ہے اور بارش ایک نیا اضافہ ہے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زمین پر پانی کا حجم تقریباً **1.4 ارب مکعب کلومیٹر** بتایا جاتا ہے، اور یہ اربوں برس سے تقریباً ثابت ہے۔ وہ بھاپ بنتا ہے، جمتا ہے، برستا ہے، بہتا ہے اور لوٹ آتا ہے — ایک ایسے بند چکر میں جو نہ کچھ بڑھاتا ہے نہ کچھ گھٹاتا ہے۔ اور فضا اور مقناطیسی میدان مل کر آبی بخارات کو خلا میں نکل جانے سے روکتے ہیں — اور مرّیخ پر یہی نہ ہو سکا، سو اس کا بیشتر پانی بھاپ بن کر خلا میں ضائع ہو گیا اور وہ ایک مردہ صحرا بن کر رہ گیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قید «**بِقَدَر**» ہی اعجاز کا مقام ہے، اور مقدار کے ثابت ہوئے بغیر اس کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔ اگر پانی ہر بار برستے وقت نیا پیدا ہوتا تو اس کے اندازے کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ اور اس سے زیادہ باریک وہ ہے جو آگے آیا: «**پھر اسے زمین میں ٹھہرا دیا**» — اور ٹھہرانا قیام اور باقی رہنے کا فائدہ دیتا ہے، خرچ ہو جانے کا نہیں؛ سو پانی زمین میں ذخیرہ ہے، اس میں خرچ نہیں ہو جاتا۔ پھر آخری تنبیہ: «**اور بےشک ہم اسے لے جانے پر بھی قادر ہیں**» — یعنی یہ میزان ایک نعمت ہے جو اٹھائی بھی جا سکتی ہے۔ اور آج اہلِ علم اسے مرّیخ میں ایک قائم حقیقت کے طور پر دیکھتے ہیں، جس نے اپنا اسّی فیصد سے زیادہ پانی کھو دیا، اور اس کے صرف دونوں قطبوں کی برف اور سطح کے نیچے کا پانی باقی رہا۔

ماخذ U.S. Geological Survey — how much water is there on Earth?

اور زمین کو اُس کے بعد اُس نے بچھا دیا

> اور زمین کو اُس کے بعد اُس نے بچھا دیا۔ اُس سے اُس کا پانی اور اُس کا چارہ نکالا
>
> **سورہ النازعات — آیتیں 30-31**

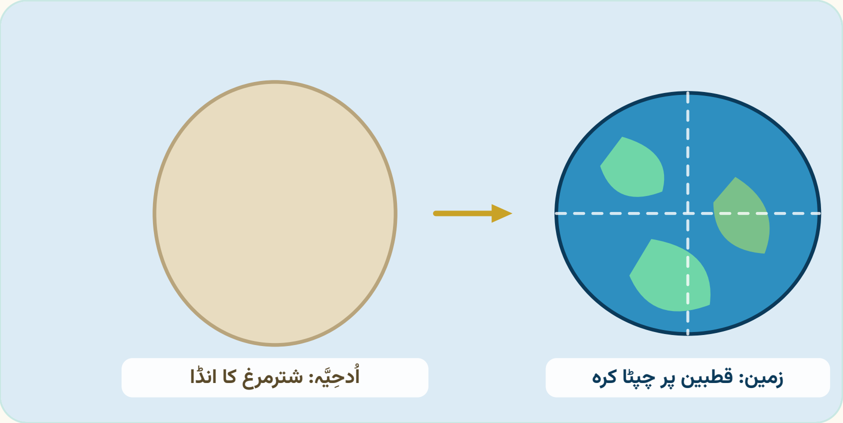

زمین کامل کرہ نہیں، بلکہ قطبین پر چپٹی اور خطِ استوا پر اُبھری ہوئی ہے

آسان لفظوں میں

عربی میں لفظ «دَحا» کے معنی ہیں: **بچھانا، وسیع کرنا اور ہموار کرنا**۔ اِسی سے «اُدحِیَّہ» ہے — شترمرغ کے انڈے رکھنے کی جگہ، جسے یہ نام اِس لیے ملا کہ وہ اُسے اپنے پاؤں سے دحو یعنی بچھاتی ہے۔ تو زمین بچھائی گئی ہے تاکہ آپ اُس پر چلیں اور اُس میں بسیں — رہی اُس کی گولائی، تو اُس کا محل **«یُکَوِّرُ»** ہے، «دَحا» نہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

عام لوگوں کے تصور میں زمین ایک ہموار سطح کے سوا کچھ نہ تھی۔ اور فلسفیوں میں سے جنھوں نے اُسے گول کہا، اُنھوں نے **کامل گول کرہ** کہا۔ رہی قطبین پر چپٹائی، تو اُس کا قائل کوئی بھی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

زمین **چپٹا کرہ** (Oblate Spheroid) ہے: خطِ استوا پر اُس کا قطر قطبین کے درمیان قطر سے تقریباً 43 کلومیٹر زیادہ ہے، اپنے محور پر گھومنے کے سبب۔ نیوٹن نے یہ 1687 میں نظری طور پر ثابت کیا، پھر فرانسیسی مہمات نے 1736 میں میدان میں ناپا۔ اور «جیوئڈ» کہلانے والی دقیق شکل اِس چپٹے کرے سے دو سو میٹر سے بھی کم ہٹتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں زبان فیصلہ کر دیتی ہے۔ عربی لغات میں «دَحا یَدحُو دَحواً»: بچھایا اور وسیع کیا، اور «اُدحِیّ» و «اُدحِیَّہ»: شترمرغ کے انڈے رکھنے کی جگہ اور اُس کا انڈا۔ اور اِس لغوی مادے میں گولائی سرے سے نہیں: **«اُدحِیّ» کا نام بچھانے سے ہے، انڈے کی شکل سے نہیں** — شترمرغ اپنی جگہ کو پاؤں سے دحو کرتی یعنی بچھاتی ہے۔ اور گولائی کا محل ایک دوسرا فعل ہے، خود کرے ہی کے مادے سے: «وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے»۔ اور یہاں «بَسَطَ» اور «مَدَّ» کے بجائے «دَحا» کا انتخاب ہمواری اور تیاری کے لیے ہے، شکل کے لیے نہیں۔ اور کنجی یہ ہے کہ اگلی آیت نے خود بچھانے کا مقصد بیان کر دیا: «اُس سے اُس کا پانی اور اُس کا چارہ نکالا» — یعنی بسنے کے لیے تیاری، نہ کہ چپٹا کر دینا۔

مآخذ Newton — *Principia*, 1687 · French Geodesic Mission to Lapland, 1736–1737

شہد میں لوگوں کے لیے شفا ہے

اُن کے پیٹوں سے ایک مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہیں، اُس میں لوگوں کے لیے شفا ہے

سورہ نحل – آیت 69

طب نے جو ثابت کیا

- بیکٹیریا کو مارتا ہے
- زخموں اور جلنے کا علاج
- بچوں کی کھانسی کو تسکین دے
- اینٹی آکسیڈنٹ اور سوزش کش
- آج ہسپتالوں میں مستعمل

خام شہد

شہد کی طبی پٹی یورپ اور امریکہ میں سرکاری طور پر منظور

شہد کی طبی پٹیاں آج سرکاری اجازت کے ساتھ دواخانوں میں بکتی ہیں

آسان لفظوں میں

قرآن نے 1400 سال پہلے کہا کہ شہد میں **شفا** ہے۔ اور آج شہد ہسپتالوں میں اُن زخموں اور جلنے کے گھاؤ کے علاج میں استعمال ہوتا ہے جن کے سامنے اینٹی بائیوٹکس بے بس رہی ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

شہد ایک میٹھی غذا اور قیمتی خوراک تھا، اور عوامی تجربے کی بنیاد پر اُس کی طرف کچھ فائدے منسوب کیے جاتے تھے۔ مگر اِلٰہی خبر کے طور پر یہ فیصلہ کر دینا کہ اُس میں **شفا** ہے، ایک بالکل اور بات ہے — خاص طور پر جب وہ ایک حشرے کے پیٹ سے نکلتا ہے، جس سے عقلاً فائدے کی توقع بعید تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شہد تین طریقوں سے قدرتی اینٹی بائیوٹک ہے: اِس کی شکر کی کثافت جراثیم سے پانی کھینچ کر اُنہیں مار دیتی ہے؛ اِس کی تیزابیت اُن کی نشوونما روکتی ہے؛ اور اِس میں موجود گلوکوز آکسیڈیز نامی خامرہ آہستہ آہستہ اور مسلسل **ہائیڈروجن پرآکسائیڈ** بناتا رہتا ہے۔ سرکاری دوا ساز اداروں نے نہ بھرنے والے پرانے زخموں کے لیے مانوکا شہد کی پٹیاں منظور کی ہیں، اور عالمی ادارۂ صحت نے بچوں کی کھانسی کے لیے شہد کی سفارش کی ہے۔ اور فرعونی مقبروں میں ملنے والا شہد تین ہزار سال بعد کھانے کے قابل نکلا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دو مقام ایسی باریکی کے ہیں جن کی توجیہ عوامی تجربے سے نہیں ہو سکتی۔ پہلا: «جس کے **رنگ** مختلف ہیں» — اور آج یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ شہد کا رنگ اور اُس کی طبی خصوصیات نباتی ماخذ کے فرق سے بدلتی ہیں، اِسی لیے اُس کا علاجی اثر بھی مختلف ہوتا ہے۔ دوسرا: «اُن کے **پیٹوں** سے نکلتا ہے» — اور شہد واقعی **شہد کے معدے** میں بنتا ہے، جو ہضم کے معدے سے الگ ایک اندرونی تھیلی ہے، وہیں اُس میں خامرے شامل کیے جاتے ہیں، پھر وہیں سے اُگل دیا جاتا ہے۔ یوں متن نے صحیح تشریحی ماخذ کو باریکی سے متعین کر دیا۔

ماخذ Cochrane Review — honey for acute cough in children · Cochrane Review — honey as a topical treatment for wounds

سورج چلتا ہے... ٹھہرا ہوا نہیں

> اور سورج اپنے ٹھہرنے کی جگہ کی طرف چلتا رہتا ہے۔ یہ اُس زبردست، سب کچھ جاننے والے کا مقرّر کیا ہوا ہے
>
> **سورہ یٰسین — آیت 38**

سورج کہکشاں کے مرکز کے گرد تیرتا ہے اور اپنے سارے سیّارے ساتھ گھسیٹتا جاتا ہے

آسان لفظوں میں

سورج اپنی جگہ کھڑا نہیں ہے۔ وہ زبردست رفتار سے **چل رہا ہے**، اور زمین اور تمام سیّاروں کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا ہماری کہکشاں کے مرکز کے گرد ایک سفر پر ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگ سورج کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھتے تھے، تو سمجھتے تھے کہ اُس کی حرکت بس زمین کے گرد ایک چکر ہے۔ پھر جدید دور آیا اور اُس نے کہا: نہیں، گھومنے والی تو زمین ہے، اور **سورج نظام کے مرکز میں ساکن ہے**۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی بھر یہی «مستحکم سائنس» رہی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سورج واقعی تین ثابت شدہ حرکتیں کرتا ہے: وہ تقریباً ہر 25 دن میں اپنے محور پر گھومتا ہے؛ وہ ملکی وے کہکشاں کے مرکز کے گرد تقریباً **220 کلومیٹر فی سیکنڈ** کی رفتار سے چلتا ہے اور ہر 225 ملین سال میں ایک چکر پورا کرتا ہے؛ اور وہ آسمان میں ایک نقطے کی طرف بھی بڑھ رہا ہے جسے «شمسی ایپکس» کہتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

غور کیجیے: آیت اُس وقت اُتری جب لوگ سمجھتے تھے کہ سورج اُن کے گرد گھومتا ہے، تو اُس نے سورج کے لیے «چلنا» ثابت کیا۔ پھر ایک دور آیا جس نے اُس سے ہر حرکت کی نفی کر دی اور کہا «وہ ساکن ہے»، تو آیت ایسی لگنے لگی جیسے سائنس کے خلاف ہو۔ پھر نئی سائنس آئی اور اُس نے سورج کے لیے ایک حقیقی چال ثابت کی جو **کسی کے تصوّر سے کہیں بڑی** تھی۔ ایک ہی عبارت جو سائنس کے دو مکمل انقلابوں کے سامنے ڈٹی رہی — اور یہی اکیلی بات ایک دلیل ہے۔

مآخذ Britannica — "Milky Way Galaxy" · Binney & Tremaine — *Galactic Dynamics*

ایک چھت جو آپ کو بچاتی ہے اور آپ اُسے دیکھتے نہیں

اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا، اور وہ اُس کی نشانیوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں

سورہ انبیا — آیت 32

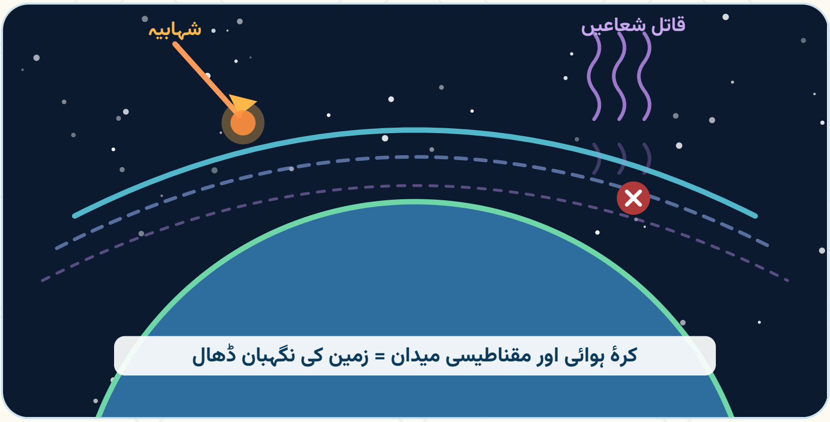

ہزاروں شہابیے ہر روز آپ تک پہنچنے سے پہلے جل جاتے ہیں، اور آپ اپنے گھر میں سو رہے ہوتے ہیں

آسان لفظوں میں

آپ کے سر پر ایک چھت ہے جو دکھائی نہیں دیتی، مگر وہ آپ کی حفاظت کرتی ہے۔ جو شہابیے ہماری طرف بڑھتے ہیں وہ پہنچنے سے پہلے اُسی میں جل جاتے ہیں، اور قاتل شعاعیں وہ روک لیتی ہے۔ **اگر وہ نہ ہوتی تو زمین پر ہر جاندار مر جاتا**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک «آسمان» یا تو خالی خلا تھا، یا ایک ٹھوس گنبد جس میں ستارے جڑے ہوئے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے اوپر ایک ایسی تہہ ہے جو **نظر نہیں آتی اور حفاظت کا کام کرتی ہے**۔ جلتا ہوا شہاب اُن کی نظر میں ایک گرتا ہوا تارا تھا، نہ کہ کوئی شہابیہ جو ایک ڈھال میں جل رہا ہو۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

کرۂ ہوائی روزانہ اندازاً سو ٹن خلائی مادّہ ہم تک پہنچنے سے پہلے جلا دیتا ہے۔ اور اوزون کی تہہ قاتل بالائے بنفشی شعاعوں کا تقریباً 99% جذب کر لیتی ہے۔ اور زمین کا مقناطیسی میدان **شمسی ہواؤں** کو روکتا ہے، جو ورنہ زمین کو اُس کی ہوا اور پانی سے محروم کر چکی ہوتیں، بالکل جیسا مرّیخ کے ساتھ ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز «سَقْف» اور «مَحفوظ» دو لفظوں کے جوڑ میں ہے۔ «سقف» پورے ڈھانپنے پر دلالت کرتا ہے، اور «محفوظ» اسمِ مفعول کا صیغہ ہے جو بتاتا ہے کہ وہ **خود بھی محفوظ ہے اور اپنے نیچے والوں کی حفاظت بھی کرتا ہے**۔ پھر اگلا جملہ آیا: «اور وہ اُس کی نشانیوں سے منہ موڑے ہوئے ہیں» — یعنی اِس چھت میں ایسی **نشانیاں** ہیں جن سے لوگ غافل رہیں گے۔ یہ صاف اشارہ ہے کہ اِس میں ایسے عجائب ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئے۔ اور ایسا ہی ہوا: اوزون کی **تہہ** 1913 سے پہلے دریافت نہ ہوئی، اور شمسی ہوا کو روکنے میں مقناطیسی میدان کا کردار «وان ایلن» پٹیوں کی 1958 میں دریافت سے پہلے معلوم نہ تھا۔

مآخذ Fabry & Buisson (1913) — the ozone layer · Van Allen (1958) — the radiation belts

63 وہ شہاب جو آسمان کی نگہبانی کرتے ہیں

اور بے شک ہم نے دنیا کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کیا، اور اُنہیں شیطانوں کے لیے رُجوم بنایا۔

سورہ مُلک – آیت 5

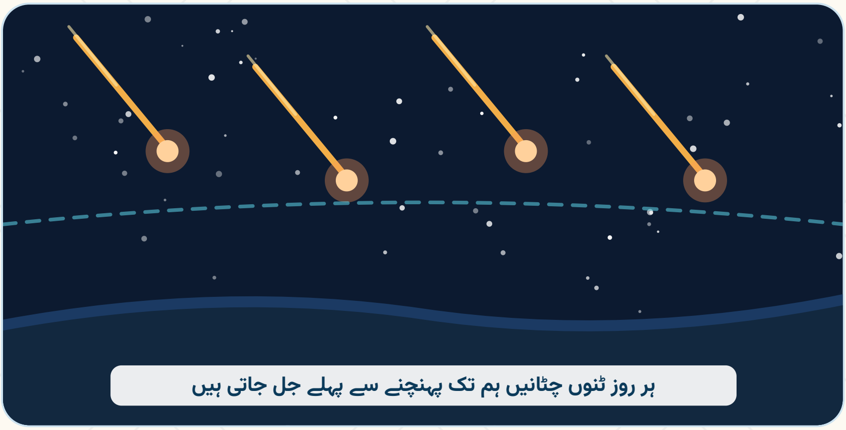

شہاب اُس وقت بھڑکتا ہے جب گولی سے تیز رفتار سے فضا میں داخل ہوتا ہے

آسان لفظوں میں

آیت ستاروں اور روشن اجرام کو ایک ساتھ دو کام دیتی ہے: **آسمان کی زینت**، اور **وہ گولے جو اوپر چوری چھپے چڑھنے والے کو بھگاتے ہیں**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

شہاب عربوں کی نظر میں «گرتے ہوئے تارے» تھے، اور دوسری تہذیبوں میں کسی بادشاہ کی موت یا کسی بڑے واقعے کی نشانی۔ رہا یہ کہ وہ **ٹھوس اجسام ہیں جو رگڑ سے جل اٹھتے ہیں** – یہ معلوم نہ تھا۔ بلکہ سرکاری علم انیسویں صدی تک اِس کا انکار کرتا رہا کہ آسمان سے پتھر گر سکتے ہیں، اور فرانسیسی اکادمی نے یہ کہنے والوں کا مذاق اڑایا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شہاب سنگ پتھریلے اور دھاتی اجسام ہیں جو دسیوں کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے فضائی غلاف میں داخل ہوتے ہیں، اور اُن میں سے اکثر ہوا کے دباؤ اور حرارت سے پوری طرح جل جاتے ہیں۔ روزانہ داخل ہونے والی مقدار کا اندازہ تقریباً **سو ٹن** ہے۔ اور فرانس میں 1803 میں «لیگل» کے واقعے کے بعد شہاب سنگوں کا گرنا علمی طور پر ثابت ہو گیا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت نے آسمانی اجرام کے دو الگ کام جدا کیے: ٹھہری ہوئی زینت، اور **چلتا ہوا رَجم**۔ اور عربی میں رَجم کا معنیٰ خاص طور پر پتھر مارنا ہے – نہ روشنی سے مارنا، نہ آگ سے۔ سو آسمان سے جلتے ہوئے اترنے والی چیز کو «رَجم» یعنی پھینکا ہوا پتھر کہنا، اُس زمانے میں جب سرکاری علم – اِس کے صدیوں بعد تک – آسمان میں پتھروں کے وجود ہی کا انکار کرتا تھا، ایسا بیان ہے جس کا اتفاق ہونا محال ہے۔

مآخذ Biot (1803) – the L'Aigle meteorite fall

ذوالقرنین کی دیوار... لوہا اور پگھلا ہوا تانبا

میرے پاس لوہے کے تختے لاؤ – یہاں تک کہ جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان برابر کر دیا تو کہا: پھونکو۔
یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا تو کہا: میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ کہ میں اس پر انڈیل دوں

سورہ کہف – آیت 96

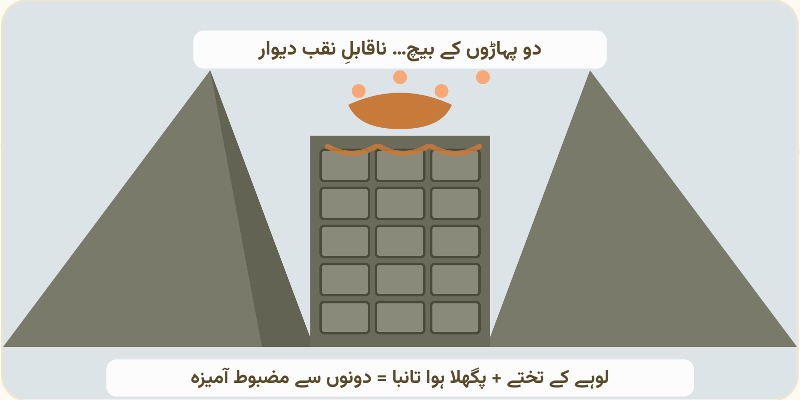

لوہے پر پگھلا تانبا انڈیلنا خلا بھر دیتا ہے اور زنگ سے بچاتا ہے

آسان لفظوں میں

ذوالقرنین نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک دیوار بنائی: **لوہے کے ٹکڑے** جما دیے، پھر آگ بھڑکائی یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئے، پھر ان پر **پگھلا ہوا تانبا** انڈیل دیا۔ اور بالکل یہی وہ طریقہ ہے جس سے انتہائی سخت اور زنگ نہ لگنے والا کھوٹ بنایا جاتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دھاتوں کا علم سادہ تھا: لوہا جو گرم گرم کوٹا جائے، اور تانبا جو سانچوں میں ڈھالا جائے۔ اور **دو دھاتوں کو ایک ہی ڈھانچے میں جوڑ دینے** کا خیال کسی تعمیری تکنیک کے طور پر معلوم نہ تھا، اور نہ یہ کہ ایک کو دوسرے پر گرم حالت میں انڈیلا ہی کیوں جائے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

گرم لوہے پر پگھلا ہوا تانبا انڈیلنے سے **تانبے کی لحیم کاری** (Brazing) جیسی چیز بنتی ہے: مائع تانبا خاصیتِ شعریت سے ٹکڑوں کے خلا میں سرایت کر جاتا ہے، انہیں مضبوطی سے باندھ دیتا ہے اور ہوا کو باہر نکال دیتا ہے۔ نتیجہ ایک ٹھوس جڑا ہوا تودہ ہے جس میں کوئی خلا نہیں۔ نیز تانبے کا غلاف **لوہے کو ہوا اور نمی سے الگ کر دیتا ہے اور یوں زنگ سے بچاتا ہے** – اور یہی آج کی دھاتی ملمع کاری کا اصول ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قدموں کی ترتیب ہی موضعِ اعجاز ہے، اور یہ ایسی ہندسی ترتیب ہے جس کے سوا کوئی اور درست ہو ہی نہیں سکتی: 1) **لوہے کے تختے** – اور «زبرہ» بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں، سو بوجھ اٹھانے والا ڈھانچہ لوہا ہے۔ 2) **پھونکنا** – یعنی حرارت بڑھانے کے لیے ہوا پہنچانا، اور یہی کام ڈھلائی خانوں میں دھونکنی کرتی ہے۔ 3) **یہاں تک کہ جب اس نے اسے آگ بنا دیا** – یعنی لوہا اس سرخی کے درجے تک پہنچ گیا جس پر وہ جڑنا قبول کرتا ہے۔ 4) **پھر پگھلا ہوا تانبا انڈیلنا** اس پر۔ اگر تانبا ٹھنڈے لوہے پر انڈیلا جاتا تو جڑتا ہی نہیں۔ سو متن انڈیلنے سے پہلے حرارت کی شرط بیان کرتا ہے – اور یہی پورے عمل کی جان ہی ہے۔

مآخذ ASM Handbook 6 — *Welding, Brazing, and Soldering*

سورج چاند کو جا نہیں پکڑتا... اور نہ ٹکراؤ

نہ سورج کے لیے یہ روا ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے بڑھنے والی ہے۔ اور سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں

سورہ یٰسین — آیت 40

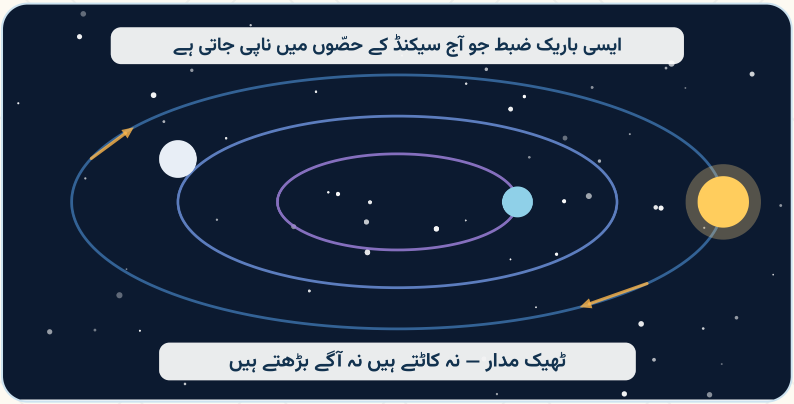

ہر جرم اپنی راہ پر ہے: نہ اس سے باہر، نہ کسی دوسرے تک

آسان لفظوں میں

آسمانی اجرام زبردست رفتاروں سے چل رہے ہیں، پھر بھی **ان میں سے کوئی دوسرے سے نہیں ٹکراتا**، اور نہ رات دن سے آگے بڑھتی ہے نہ اس سے پیچھے رہتی ہے۔ ایک ایسا نظام جو پلک جھپکنے بھر کو بھی نہیں بگڑتا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُس وقت نہ اجرام کی رفتاروں کا علم تھا، نہ ان کے مداروں کا، نہ ان کی حرکت کے قوانین کا۔ اور گرہن کی تعبیر غضب یا کسی آنے والی آفت سے کی جاتی تھی، اس سے نہیں کہ یہ **ایسے مقررہ اوقات ہیں جو صدیوں پہلے شمار کیے جا سکتے ہیں**۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اجرام کے مدار ایسی باریکی سے بندھے ہیں کہ ماہرینِ فلکیات دنگ رہ جاتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد اپنا مدار 30 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے طے کرتی ہے، چاند اس کے گرد گھومتا ہے، اور کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اور نظام کی درستی اس حد کو پہنچی ہے کہ **اِس صدی کے گرہن سیکنڈ کی باریکی سے شمار کیے جاتے ہیں**، اور آنے والے ایک ہزار برس کے گرہن چند دسیوں منٹ کے فرق تک — اور اس فرق کا سبب زمین کی گردش کی رفتار کا بدلنا ہے، مداروں کی کوئی خرابی نہیں۔ اور اسی ضبط پر خلائی سفر کی ساری نقل و حرکت کھڑی ہے: ایک گاڑی آج چھوڑی جاتی ہے تاکہ سات برس بعد ایک پہلے سے شمار کیے ہوئے مقام پر کسی سیّارے سے جا ملے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

«**روا ہے**» کی تعبیر ہی باریکی کا مقام ہے۔ یہ صرف واقع ہونے کی نفی نہیں کرتی، بلکہ **امکان** ہی کی نفی کرتی ہے — یعنی نظام خود اس کی اجازت نہیں دیتا، یہ نہیں کہ محض اتفاقاً ایسا نہیں ہوا۔ اور یہی **طبیعی قانون** کا عین مفہوم ہے۔ پھر تفصیل پر غور کیجیے: سورج کے چاند کو جا پکڑنے کی نفی کی — اور یہ دونوں دو مختلف مداروں میں ہیں؛ اور رات کے دن سے آگے بڑھنے کی نفی کی — اور یہ دونوں زمین کی گردش کے تابع ہیں۔ دو الگ اسباب والے مظاہر، ایک ہی قاعدے کے تحت جمع کر دیے گئے: «**اور سب ایک ایک مدار میں تیر رہے ہیں**» — یعنی دونوں صورتوں میں علّت ایک ہی ہے: ہر جرم کا اپنے مدار کا پابند ہونا۔

مآخذ Newton — *Principia*, 1687 (orbital mechanics)

66

آپ رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی نہ دیکھیں گے

جس نے سات آسمان تہ بہ تہ بنائے۔ آپ رحمٰن کی تخلیق میں کوئی بے ربطی نہ دیکھیں گے۔ پھر نگاہ دوڑائیے — کیا آپ کو کوئی شگاف دکھائی دیتا ہے؟

سورہ المُلک – آیت 3

- کششِ ثقل: ذرا بڑھ جاتی تو کائنات پچک جاتی
- نویاتی قوت: ذرا کم ہوتی تو ایک عنصر بھی نہ بنتا
- کائنات کی ابتدائی کثافت: تصوّر سے بڑھ کر ضبط
- تاریک توانائی کا ثابت: طبیعیات کا باریک ترین عدد

«پھر نگاہ دوڑائیے، کیا کوئی شگاف ہے؟»

کائنات کے ثوابت ایسی حد پر بندھے ہیں جو ذرا سے انحراف کی بھی گنجائش نہیں رکھتی

آسان لفظوں میں

آیت آپ کو چیلنج کرتی ہے کہ کائنات میں نگاہ دوڑا کر اس میں **کوئی خرابی، کوئی شگاف یا کوئی کمی** تلاش کیجیے۔ پھر دہراتی ہے: دوبارہ دیکھیے۔ اور آج سائنس کہتی ہے کہ کائنات کے ثوابت ایسی باریکی سے بندھے ہیں جس پر عقل یقین ہی نہیں کر پاتی۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

کائنات کو ایک عمومی، جمالیاتی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور «طبیعی ثوابت» کا تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا، اور نہ یہ خیال کہ کائنات ایسے اعداد پر قائم ہے کہ ان میں سے ایک بھی ذرا سا بدل جائے تو سب کچھ ڈھے جائے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جدید طبیعیات اسے **«باریک ضبط»** (Fine-Tuning) کہتی ہے۔ اگر کششِ ثقل کی قوت ایک نہایت معمولی نسبت سے مختلف ہوتی تو ستارے کبھی نہ بنتے یا کائنات فوراً بھِنچ کر رہ جاتی؛ اگر شدید نویاتی قوت ایک چھوٹی سی نسبت سے مختلف ہوتی تو نہ کاربن ہوتا نہ آکسیجن؛ اور تاریک توانائی کے ثابت کو **ساری طبیعیات کا سب سے باریک عدد** کہا جاتا ہے۔ اور بڑے بڑے ماہرینِ طبیعیات نے اس کا اعتراف کیا ہے — جیسے فریڈ ہوئل، جس نے کہا کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ ایسا لگتا ہے گویا «کسی برتر عقل نے طبیعیات کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی ہو»۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت میں بات محض ایک خبر نہیں، بلکہ **جانچنے اور بار بار جانچنے کی صریح دعوت** ہے: «پھر نگاہ دوڑائیے»، پھر «دو بار نگاہ دوڑائیے»۔ یعنی یہ اس پر داؤ لگاتی ہے کہ باریک بینی **اسے مضبوط ہی کرے گی، توڑے گی نہیں**۔ اور لفظاً یہی ہوا: مشاہدے کے آلات جتنے زیادہ باریک ہوتے گئے، ضبط اتنا ہی زیادہ کھل کر سامنے آتا گیا۔ اور لفظ «**فُطور**» کے معنی ہیں شگاف اور دراڑیں، اور «**تَفاوُت**» کے معنی ہیں بے ترتیبی اور بے تناسبی۔ سو آیت کائنات سے دو صفتیں نفی کرتی ہے: نسبتوں میں خرابی، اور عمارت میں دراڑ — اور بالکل یہی وہ چیز ہے جو ایک ماہرِ طبیعیات کسی کونیاتی نمونے کو جانچتے وقت تلاش کرتا ہے۔

مآخذ Martin Rees — *Just Six Numbers*, 1999 · Weinberg (1989) — the cosmological constant problem

ستاروں کے مقامات کی قسم... خود ستاروں کی نہیں

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی — اور بے شک یہ بڑی قسم ہے، اگر آپ جانیں۔

سورہ واقعہ — آیات 75–76

ستارے کی روشنی برسوں سفر کرتی ہے، سو جو آپ دیکھتے ہیں وہ اُس کا پرانا مقام ہے، موجودہ جگہ نہیں

آسان لفظوں میں

جب آپ رات کو کسی ستارے کو دیکھتے ہیں تو آپ ستارے کو نہیں دیکھ رہے! آپ **وہ روشنی دیکھ رہے ہیں جو برسوں پہلے اُس سے نکلی تھی**، شاید ہزاروں برس پہلے۔ ہو سکتا ہے وہ ستارہ خود بجھ کر ختم ہو چکا ہو اور آپ اب بھی اُسے دیکھ رہے ہوں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

ارسطو اور اُس کے پیروکاروں کے نزدیک روشنی بغیر کسی وقت کے، فوراً ظاہر ہو جاتی تھی؛ اِمپیڈوکلیس جیسے چند لوگوں کے سوا کسی نے اختلاف نہ کیا، وہ بھی بغیر دلیل کے۔ ستارہ وہی تھا جو آپ دیکھتے ہیں، اُسی جگہ جہاں دیکھتے ہیں، اور بات ختم۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

روشنی کی رفتار تقریباً 300 ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے — تیز ضرور، مگر **محدود**۔ سورج کے بعد ہمارا قریب ترین ستارہ 4.2 نوری سال دور ہے، اور جو کچھ ہم ننگی آنکھ سے دیکھتے ہیں اُس میں سے کچھ ہزاروں نوری سال دور ہے۔ سو آج رات آپ جو آسمان دیکھتے ہیں وہ **پرانی تصویروں کا البم** ہے، اُس کا ہر ستارہ کسی اور زمانے کا۔ اور واقعی ایسے ستارے دیکھے جا چکے ہیں جو صدیوں پہلے پھٹ چکے اور اُن کی روشنی اب تک ہم تک پہنچ رہی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قسم خود ستاروں کی نہیں کھائی گئی، بلکہ **اُن کے مقامات** کی — اور یہ ایسی تخصیص ہے جس کا کوئی سبب نہیں، سوائے اِس کے کہ ستارے اور اُس کے مقام میں کوئی حقیقی فرق ہو۔ پھر اگلی آیت کھول کر کہتی ہے: «اور بے شک یہ بڑی قسم ہے، **اگر آپ جانیں**» — یعنی اِس قسم کی عظمت ایک ایسے علم پر موقوف ہے جو سننے والوں کے پاس نہ تھا۔ ایک متن صاف کہہ رہا ہے: یہاں ایک راز ہے جو آپ بعد میں جان لیں گے۔ اور وہ جان لیا گیا۔

ماخذ U.S. Naval Observatory — *Explanatory Supplement* (light-travel time)

آپ ھی جیسی امتیں

> اور زمین میں چلنے والا کوئی جانور نہیں، اور نہ کوئی پرندہ جو اپنے دو پروں سے اڑتا ھے، مگر وہ آپ ھی جیسی امتیں ھیں
>
> **سورہ انعام — آیت 38**

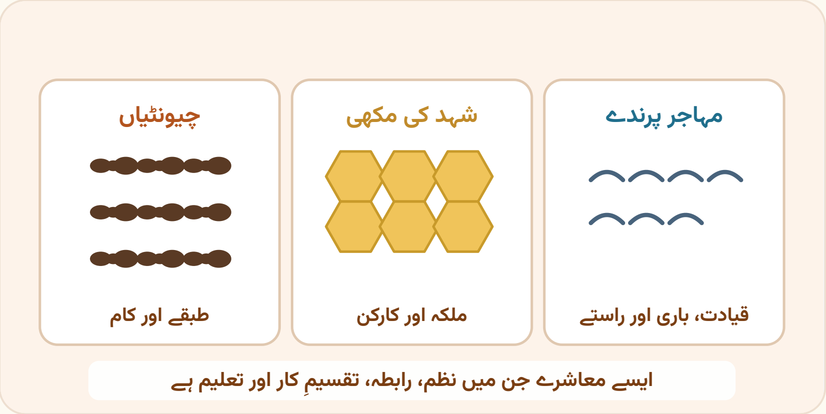

جانور بکھرے ہوئے افراد نہیں، بلکہ منظم معاشرے ہیں

آسان لفظوں میں

قرآن نے جانوروں کو **«امتیں»** کہا — اور امت وہ گروہ ہے جس کا اپنا نظام، اپنی زبان اور اپنی روایات ہوں۔ اور فرمایا کہ وہ «آپ ہی جیسے» ہیں۔ آج سائنس ثابت کرتی ہے کہ جانوروں کے معاشرے نہایت منظم ہیں۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

قدما نے چیونٹیوں اور مکھیوں کی اجتماعی زندگی دیکھی تھی، یہاں تک کہ ارسطو نے انہیں انسان کے ساتھ ایک ہی باب میں رکھا۔ لیکن یہ سب ظاہری بیان رہا، جو پورے کا پورا ایک جامد جبلت کی طرف لوٹا دیا جاتا: نہ سیکھی ہوئی زبان، نہ منتقل ہونے والی ثقافت، نہ علاقائی لہجے۔ اور جانور اور انسان کے درمیان خلیج مطلق تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

جانوروں کے طرزِ عمل کی سائنس نے حقیقی معاشروں کا وجود ثابت کر دیا ہے: چیونٹیوں اور مکھیوں میں کام کی سخت تقسیم؛ وہیل اور ڈولفن کی پیچیدہ رابطہ زبانیں جن کے **علاقائی لہجے** تک ہیں؛ چمپینزی میں سیکھ کر منتقل ہونے والی ثقافتیں؛ پرندوں میں ہجرت کا نظم اور قیادت کی باری؛ اور پتے کاٹنے والی چیونٹی میں «زراعت» کا نظام تک، جو زمین کے نیچے کھیتوں میں کھمبی اگاتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز دو لفظوں میں ہے۔ «**امم**»: عربی میں یہ مشترکہ معاملے والا منظم گروہ ہے، محض ریوڑ نہیں۔ اور «**امثالکم**»: یعنی آپ جیسے اس اعتبار سے کہ وہ اپنے نظام رکھنے والے معاشرے ہیں، نہ کہ عقل اور تکلیف میں آپ جیسے۔ کچھ عرصہ پہلے تک سرکاری سائنس اس سے انکار کرتی تھی کہ جانور کی طرف ثقافت یا زبان منسوب کی جائے، اور اسے غیر سائنسی «انسان انگاری» شمار کرتی تھی — پھر شواہد کے سامنے پیچھے ہٹ گئی۔ رہا یہ جملہ کہ «جو **اپنے دو پروں سے** اڑتا ہے»، تو یہ ایک قابلِ توجہ تخصیص ہے، کیونکہ یہ اسے خارج کر دیتی ہے جو دو پروں کے بغیر اڑتا ہے۔

مآخذ Hölldobler & Wilson — *The Ants*, 1990 · Frans de Waal — *Are We Smart Enough…*, 2016

سب سے کمزور گھر... اور مادہ مکڑی

ان لوگوں کی مثال جنھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا لیے، مکڑی کی سی مثال ھے جس نے ایک گھر بنایا؛ اور بے شک سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ھے

سورہ عنکبوت – آیت 41

مکڑی کا گھر

- مادہ اکیلی بناتی ہے
- نر نہیں بناتا
- کبھی نر کو کھا جاتی ہے
- اپنے بچے کھا جاتی ہے
- بالکل بے امان گھر

اُس کا دھاگا فولاد سے مضبوط… اور اُس کا گھر سب سے کمزور

کمزوری تار میں نہیں، بلکہ اس «گھر» کے اندر کے رشتوں میں ہے

آسان لفظوں میں

مکڑی کا جو گھر ہم دیکھتے ہیں وہ **بالغ مادہ** بناتی ہے، بالغ نر کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ سب سے کمزور گھر اس لیے نہیں کہ اس کا تار کمزور ہے — بلکہ اس لیے کہ وہ **ایسا گھر ہے جس میں نہ رحم ہے نہ امان**: مادہ اپنے جوڑے اور اپنے بچوں تک کو کھا جاتی ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مکڑی ہر گھر کی جانی پہچانی مخلوق ہے، اور اس کا جالا کمزوری کی کھلی مثال۔ لیکن بنانے والے میں نر اور مادہ کا فرق، اور جالے کے اندر جو چیر پھاڑ ہوتی ہے، یہ معلوم نہ تھا — یہ ایسی تفصیلات ہیں جو دقیق سائنسی مشاہدے کے بغیر نظر ہی نہیں آتیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

شکار کے جو جالے ہم دیکھتے ہیں وہ غالب اکثریت میں **بالغ مادائیں** بنتی ہیں؛ مکڑی کمسنی میں تار بنتی ہے، نر ہو یا مادہ، پھر نر بالغ ہو کر بیشتر انواع میں شکاری جالا بنانا چھوڑ دیتا ہے اور مادہ کی تلاش میں آوارہ پھرنے لگتا ہے۔ درجنوں انواع میں مادہ جفتی کے بعد نر کو مار کر کھا جاتی ہے، اور بعض انواع میں بچے اپنی ماں کو کھا جاتے ہیں یا وہ انھیں۔ رہا خود تار، تو وہ معلوم مضبوط ترین مادوں میں سے ہے: اپنے وزن کے تناسب سے فولاد سے بھی زیادہ مضبوط۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اگر کمزوری تار کی مضبوطی میں ہوتی تو یہ متن سائنس سے ٹوٹ جاتا، کیونکہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکڑی کا تار فطرت کی سخت ترین چیزوں میں سے ہے۔ لیکن آیت **گھر** کی بات کرتی ہے، تار کی نہیں، اور عربی میں گھر کا مطلب اہل و عیال، سکون اور امان ہے۔ اور سارا سیاق **ایسے بگڑے ہوئے رشتے کے بارے میں ہے جو اپنے صاحب کو کوئی نفع نہیں دیتا**۔ چنانچہ یہ وصف سماجی اعتبار سے دقیق ہے، مادی اعتبار سے نہیں۔ اور اس کی تصدیق یہ ہے کہ فعل مؤنث آیا: «**اتخذت** بیتاً» — اور وہی ہے جو حقیقتاً اسے بناتی ہے، نر نہیں۔

مآخذ Foelix — *Biology of Spiders* · Vollrath & Knight (2001), Nature 410

ایک پر میں بیماری اور ایک پر میں دوا

جب آپ میں سے کسی کے مشروب میں مکھی گر جائے تو اسے پورا ڈبو دے، پھر نکال دے،
کیونکہ اس کے ایک پر میں بیماری ہے اور دوسرے میں شفا

بخاری نے روایت کیا — صحیح

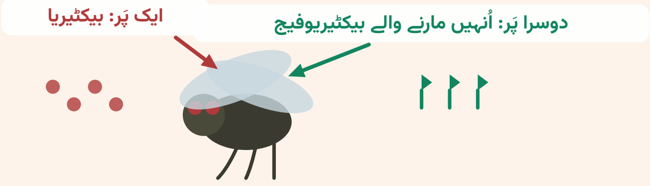

وائرس جو صرف بیکٹیریا کو مارتے ہیں :(Bacteriophages) بیکٹیریوفیج
1915 میں دریافت ہوئے — آج علاج کے طور پر مستعمل

بیکٹیریوفیج زمین پر سب سے زیادہ تعداد والی مخلوق ہیں، اور ان کا واحد کام بیکٹیریا کو مارنا ہے

آسان لفظوں میں

مکھی جراثیم اٹھاتی ہے — یہ معلوم بات ہے۔ لیکن حدیث کچھ اور کہتی ہے: اس کے ساتھ **وہ چیز بھی ہے جو ان جراثیم کو مار ڈالتی ہے**۔ اور سائنس نے واقعی ایسی باریک مخلوق دریافت کی جس کا واحد کام بیکٹیریا کا شکار کرنا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

بیکٹیریا سرے سے معلوم ہی نہ تھے — وہ 1676 میں لیون ہک کی خوردبین سے پہلی بار دیکھے گئے۔ چنانچہ مکھی کے اٹھائے ہوئے «مرض» کی بات جراثیمی نظریے سے ایک ہزار سال پہلے کی ہے۔ رہا اس کے ساتھ **شفا** کا ہونا، تو اسے سمجھنے کا کوئی ڈھانچہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بیکٹیریوفیج (Bacteriophages): ایسے باریک وائرس جو صرف بیکٹیریا کو لگتے اور انہیں مار ڈالتے ہیں؛ انہیں ٹورٹ نے 1915 میں اور دیریل نے 1917 میں دریافت کیا۔ یہ **روئے زمین پر سب سے زیادہ تعداد والی مخلوق ہیں**، اور وہیں جمع ہوتے ہیں جہاں بیکٹیریا کثرت سے ہوں — یعنی مکھی پر اور اس کے ٹھکانوں میں۔ اور یہ واقعی گھریلو مکھی پر پائے گئے ہیں۔ فیج سے علاج آج ایک قائم شدہ طبی تخصص ہے، جو ان صورتوں میں برتا جاتا ہے جہاں اینٹی بایوٹک ناکام ہو جائیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

حدیث نے صرف دوا کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ **ایک عملی ہدایت** دی: پورا ڈبونا۔ اور دلالت کی جگہ یہی ہے — کیونکہ ڈبونے کا کوئی مطلب نہیں مگر یہ کہ ضدِ جراثیم مادے کو کام کرنے کے لیے مائع میں چھوڑا جانا ضروری ہو۔ پھر **دو پروں** کے درمیان فرق: ایک نقصان اٹھائے ہوئے اور دوسرا علاج۔ یہ ایسی تقسیم نہیں جو بات گھڑنے والے کے ذہن میں آئے؛ متوقع تو یہ تھا کہ کہا جاتا «مکھی میں بیماری بھی ہے اور دوا بھی»۔ رہا ہر ایک کو ایک متعین پر کی طرف منسوب کرنا، تو یہ ایسی تعیین ہے جو آزمائی جا سکتی ہے — اور سائنس نے آ کر اس کی تصدیق کر دی۔

مآخذ Twort (1915) · d'Hérelle (1917) — bacteriophages · Leeuwenhoek — the first sight of bacteria, 1676 · Eliava Institute, Tbilisi — phage therapy

شگافوں والی زمین

قسم ہے لوٹانے والے آسمان کی، اور شگاف والی زمین کی۔

سورہ طارق — آیات 11–12

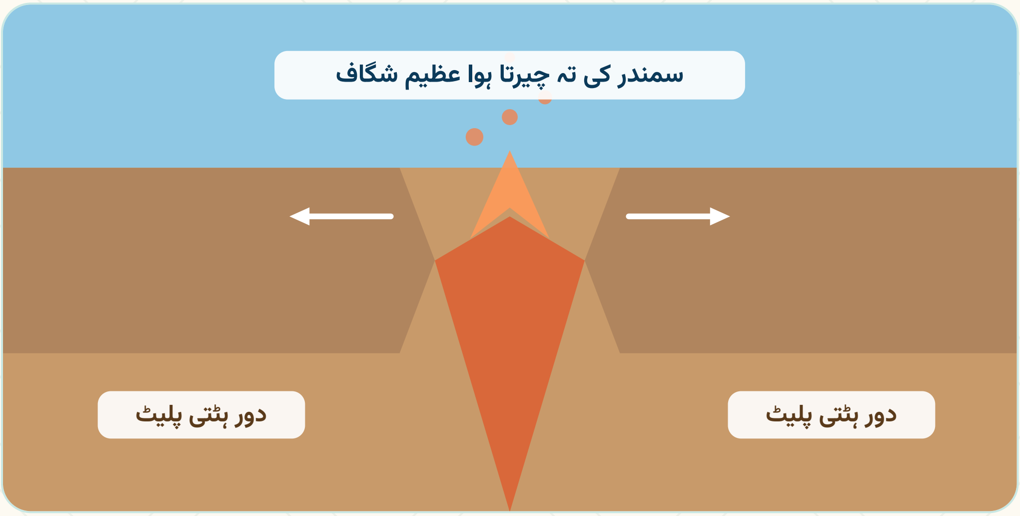

سمندروں کے نیچے شگافوں کا سلسلہ جو پوری زمین کو گھیرے ہوئے ہے، لمبائی 65 ہزار کلومیٹر

آسان لفظوں میں

زمین کوئی ٹھوس، جُڑا ہوا گولا نہیں۔ اُس کی قِشر **پھٹی ہوئی** ہے — اُس میں بہت بڑے شگاف ہیں جو پورے سیّارے کو گھیرے ہوئے ہیں، اور اُن میں سے گہرائیوں کا پگھلا ہوا پتھر نکلتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زمین کو ایک ہی ٹھوس، جُڑا ہوا جسم سمجھا جاتا تھا۔ رہا پوری زمین کو «شگاف والی» یعنی پھٹی ہوئی کہنا — تو اُس زمانے میں کسی کے تجربے میں اِس کا کوئی مطلب نہ تھا؛ نظر آنے والے شگاف خشک زمین کے چٹخنے یا وادیوں کے نالوں سے آگے نہ تھے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

اِسے **«وسطِ سمندر کا سلسلہ»** (Mid-Ocean Ridge) کہتے ہیں: آتش فشانی شگافوں کا سلسلہ جس کی لمبائی تقریباً 65 ہزار کلومیٹر ہے، جو ٹینس کی گیند کی سلائی کی طرح پورے سیّارے کے گِرد لپٹا ہے۔ اُس میں سے پگھلا مادّہ نکل کر نئی قِشر بناتا ہے۔ یہ بیسویں صدی کی پچاس کی دہائی میں سونار سے دریافت ہوا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

یہاں قسم زمین کو ایک **کُلّی، لازمی صفت** سے موصوف کر رہی ہے: «شگاف والی زمین» — جیسے اُس جگہ کو «درختوں والی» کہا جاتا ہے جس کی طبیعت ہی درخت اگانا ہو۔ یہ کسی عارضی شگاف کی بات نہیں کر رہی، بلکہ شگاف کو خود سیّارے کی صفت بنا رہی ہے۔ اور ارضیاتی حقیقت بعینہٖ یہی ہے: زمین ایک ایسا سیّارہ ہے **جس کی قِشر فطرتاً پھٹی ہوئی ہے**، اور زلزلوں، آتش فشانوں اور براعظموں کی حرکت کی اصل یہی ہے۔

ماخذ: Marie Tharp — the maps of the ocean floor · NOAA — the Mid-Ocean Ridge

بھڑکایا ہوا سمندر — پانی کے نیچے آگ

قسم ہے طور کی، اور لکھی ہوئی کتاب کی ... اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی

سورہ الطور — آیات 1-6

زمین کی آتش فشانی سرگرمی کا 80% سے زیادہ حصہ سمندروں کی سطح کے نیچے ہوتا ہے

آسان لفظوں میں

سمندر کے نیچے آگ جل رہی ہے! سمندروں کی تہ میں آتش فشاں اور دراڑیں ہیں جو چار سو درجے کا پانی اُگلتی ہیں۔ تو سمندر **مسجور** ہے — نیچے سے سلگایا ہوا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پانی اور آگ ایسی دو ضدیں ہیں جو جمع نہیں ہو سکتیں — یہ ہر انسان کے نزدیک بدیہی ہے۔ سمندر تو ٹھنڈک اور بجھانے کی علامت ہے۔ سو سمندر کو «مسجور» کہنا سننے والوں کو ایک مبہم تعبیر لگی جس کی حقیقت میں کوئی مثال نہ تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سمندروں کے نیچے ایک عظیم آتش فشانی سلسلہ ہے، اور زمین پر آتش فشانی اخراج کا 80% سے زیادہ پانی کے نیچے ہوتا ہے۔ 1977 میں **آبی حرارتی دراڑیں** دریافت ہوئیں جو 400 درجے سے زیادہ گرم پانی اُچھالتی ہیں، اور شدتِ دباؤ کے سبب وہ اُبلتا نہیں۔ اور اِن آگوں کے گرد ایک پوری زندگی ہے جو سورج کی روشنی پر سرے سے انحصار نہیں کرتی۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

عربی میں «سَجَرَ» کے معنی ہیں **تنور کو بھڑکانا اور آگ سے بھر دینا** — اِسی سے «وإذا البحار سُجِّرت» ہے۔ تو یہ وصف بھڑکانے میں صریح ہے، نہ بھرنے میں نہ بہنے میں۔ اور بھڑکائے ہوئے سمندر کی قسم نے قسموں کے ایک سلسلے کو ختم کیا — کوہِ طور، لکھی ہوئی کتاب، آباد گھر اور بلند چھت — یعنی یہ حقیقی اور موجود چیزوں کے سیاق میں آئی۔ پس یہ ایک قائم حقیقت کی قسم ہے، جسے انسان نے 1350 برس بعد دریافت کیا۔

ماخذ Corliss et al. (1979) — thermal springs on the Galápagos Rift

مذاق اڑانے والوں سے ہم آپ کے لیے کافی ہیں

بے شک ہم مذاق اڑانے والوں سے آپ کے لیے کافی ہیں ۞ وہ جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہراتے ہیں — سو عنقریب وہ جان لیں گے

سورہ حجر – آیتیں 95-96

مکہ میں تمسخر کے سرغنے تھوڑے ہی عرصے میں ایک کے بعد ایک مر گئے

آسان لفظوں میں

مکہ میں کچھ مشہور لوگ تھے جو نبی ﷺ کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھے اور آپ کو ستاتے تھے۔ تب ایک آیت نازل ہوئی جو کہتی تھی: **ہم ان سے آپ کے لیے کافی ہیں**۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ سب ہلاک ہو گئے، ہر ایک الگ سبب سے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

یہ لوگ قریش کے سرداروں اور جاہ و مال والوں میں سے تھے، اور اپنی قوت اور اثر کے عروج پر تھے۔ اور نبی ﷺ اور آپ کے ساتھی سب سے کمزور حال میں: گھیرے ہوئے، ستائے ہوئے، نہ ان کے پاس کوئی لشکر تھا اور نہ کوئی پناہ۔ اور ان کی اذیت روکنے کا بھی کوئی انسانی ذریعہ نہ تھا، چہ جائیکہ انہیں ہلاک کرنے کا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سیرت اور تاریخ کی کتابیں – اور ان میں سب سے قدیم ابن اسحاق کی سیرت بروایتِ ابن ہشام – بتاتی ہیں کہ تمسخر کے سرغنے پانچ تھے، اور وہ سب ہجرت سے پہلے یا اس کے آس پاس ایک ہی قریبی مدت میں ہلاک ہو گئے، ایسے مختلف اسباب سے جن میں کوئی قدرِ مشترک نہیں: ایک بیماری، ایک وبا، ایک حادثہ، ایک کانٹا جو چبھ گیا، اور ایک زخم جو سڑ گیا۔ اور ان میں سے کوئی ایسا باقی نہ رہا جو اس کے بعد دعوت کی مخالفت کرتا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

متن میں **ایک ضمانت** ہے، محض کوئی دعا یا امید نہیں۔ اور ضمانت ایسا التزام ہے جس کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے، اور پھر اس کا کہنے والا فوراً اپنے مخالفوں کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان میں سے ایک بھی برسوں ستاتا اور مذاق اڑاتا رہتا تو آیت ان کے حق میں نہیں، ان کے خلاف حجت بن جاتی۔ اور اس سے بھی اہم بات: یہ وعدہ **شہر کے سب سے طاقتور لوگوں کے خلاف، سب سے کمزور کے حق میں** دیا گیا – اور یہ ایک ایسا انداز ہے جو پورے قرآن میں دہرایا جاتا ہے: «عنقریب یہ جتھا شکست کھائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا» مکہ میں بدر سے برسوں پہلے نازل ہوئی، اور نبی ﷺ نے بدر کے دن اسے پڑھا، تو وہ واقع ہو گئی۔

74

آسمان کاغذ کی طرح لپٹ جائے گا

جس دن ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے جیسے لکھے ہوئے طومار لپیٹے جاتے ہیں۔ جیسے ہم نے پہلی بار خلق کا آغاز کیا، ویسے ہی اُسے دھرائیں گے

سورہ انبیا — آیت 104

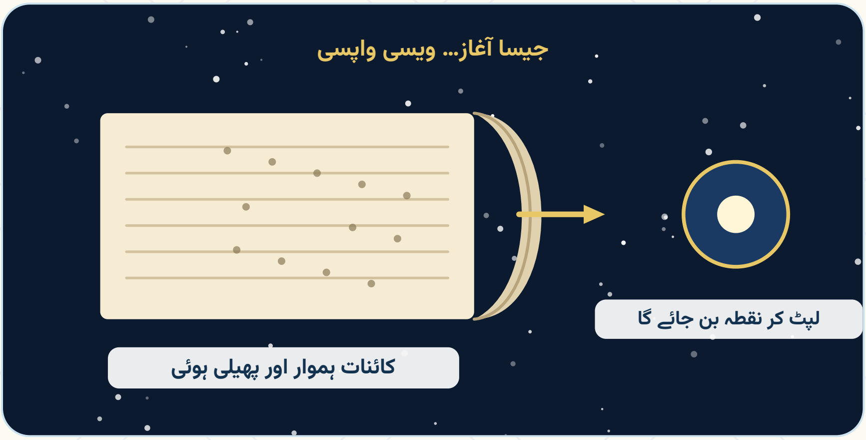

کائنات ایک نقطے سے پھیلی… اور لپٹ کر ایک نقطے ہی کی طرف لوٹ جائے گی

آسان لفظوں میں

آیت کہتی ہے کہ کائنات کا انجام ایک **لپیٹ** ہوگا — یعنی سکڑنا اور لپٹنا، جیسے آپ کاغذ کا ایک ورق لپیٹتے ہیں۔ پھر وہ ایک عجیب بات کہتی ہے: یہ انجام بالکل **آغاز جیسا** ہوگا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

اُفق پر «کائنات کا خاتمہ کیسے ہوگا؟» نام کا کوئی سوال ہی نہ تھا، کیونکہ لوگوں کے گمان میں کائنات ازلی اور ابدی تھی، نہ اُس کی کوئی ابتدا نہ کوئی انتہا۔ اور انجام کی شکل کو آغاز کی شکل سے جوڑنے کے لیے کوئی ایسا ڈھانچہ سرے سے تھا ہی نہیں جس میں یہ بات سمجھ آتی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

نظری طبیعیات میں کائنات کے انجام کے سب سے مشہور منظرناموں میں سے ایک **«عظیم سکڑاؤ»** (Big Crunch) ہے: کشش پھیلاؤ پر غالب آ جاتی ہے، تو کائنات اپنے ہی اوپر سکڑتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہے — انتہائی کثافت والا ایک نقطہ۔ یعنی **انجام آغاز کی اُلٹی تصویر ہے۔**

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

اعجاز یہاں آیت کے دوسرے نصف میں ہے: «جیسے ہم نے پہلی بار خلق کا آغاز کیا، ویسے ہی اُسے دہرائیں گے»۔ یہ جملہ ایک قاعدہ طے کر دیتا ہے: **انجام کی شکل = آغاز کی شکل**۔ اور اِس طرح یہ ہمیں ضمناً بتا دیتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز میں **لپٹی ہوئی** تھی — یعنی ایک نقطے میں سمٹی ہوئی — اور یہی عین وہ بات ہے جو عظیم دھماکے کا نمونہ کہتا ہے۔ ایک ہی آیت نے آغاز اور انجام دونوں دے دیے، اُس زمانے میں جب کسی کے ذہن میں کائنات کی نہ کوئی ابتدا تھی نہ کوئی انتہا۔

ماخذ: The Big Crunch · Ryden — *Introduction to Cosmology*

75

وہ ستارہ جو دستک دیتا اور چھید ڈالتا ہے

قسم ہے آسمان کی اور رات کے آنے والے کی ۝ اور آپ کیا جانیں کہ رات کا آنے والا کیا ہے؟
چھید ڈالنے والا ستارہ ۝

سورہ طارق — آیات 1–3

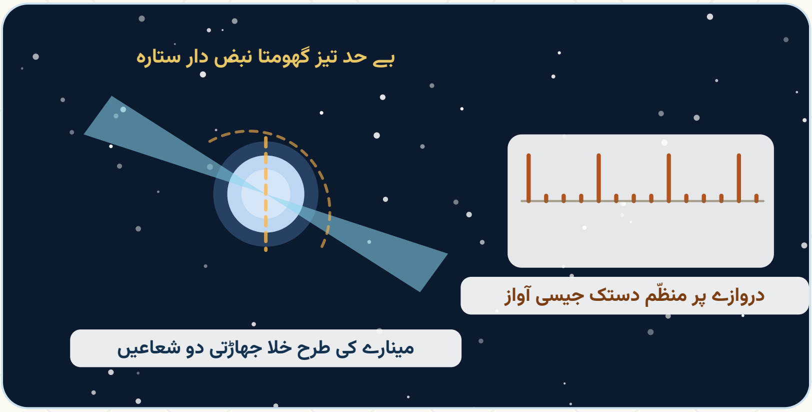

نبض دار ستارہ ایسی باقاعدہ نبضیں بھیجتا ہے جیسے ہتھوڑے کی ضربیں جو کبھی نہیں چوکتیں

آسان لفظوں میں

کچھ ستارے ایسے اشارے بھیجتے ہیں **جیسے دروازے پر باقاعدہ دستکیں ہوں**: ٹھک… ٹھک… ٹھک… اُس گھڑی سے بھی زیادہ ٹھیک جو انسان نے کبھی بنائی ہے۔ اور قرآن نے اُسے «الطّارِق» کہا — یعنی وہ جو دستک دیتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک ستارہ روشنی کا ایک خاموش، ساکن نقطہ تھا۔ نہ اُس کی کوئی آواز، نہ نبض، نہ کوئی چھید۔ اور لفظِ «طَرْق» — یعنی بار بار آواز کے ساتھ ضرب لگانا — کو آسمان کے کسی ستارے سے جوڑنا، اُس زمانے کے کسی سننے والے کے لیے بےمعنیٰ بات تھی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

1967 میں ماہرِ فلکیات جوسلین بیل نے خلا سے ایسے ریڈیائی اشارے پکڑے جو حیران کن باقاعدگی کے ساتھ دہرائے جا رہے تھے، یہاں تک کہ ٹیم نے پہلے اُنہیں ذہین مخلوقات کے پیغام سمجھا اور اُن کا نام LGM-1 رکھ دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ **نبض دار نیوٹران ستارے** (Pulsars) ہیں: پھٹ چکے ستاروں کی باقیات، جو تقریباً ہر سیکنڈ اپنے گرد ایک چکر لگاتے ہیں — اور اُن میں سب سے تیز ایک سیکنڈ میں سیکڑوں بار — اور دو شعاعیں چھوڑتے ہیں جو مینارۂ نور کی طرح خلا کو جھاڑتی ہیں۔ اور جب اُن کے اشارے آواز میں بدلے گئے تو وہ بالکل **ایک باقاعدہ دستک** تھے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

دونوں لفظ مل کر کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے: «الطّارِق» = وہ جو بار بار دستک کی آواز پیدا کرے، اور «الثّاقِب» = وہ جو چیر کر پار نکل جائے۔ اور نبض دار ستارہ دونوں وصف لفظاً جمع کر دیتا ہے: اُس کے اشارے ایک باقاعدہ دستک ہیں، اور وہ ہزاروں نوری سال چیر کر کہکشاں کی گرد کے پار ہم تک پہنچتے ہیں۔ بلکہ خود قسم کے بعد ایک استفہامی جملہ آیا: «اور آپ کیا جانیں کہ طارق کیا ہے؟» — یعنی یہ ایسی چیز ہے **جس کے جاننے کا کوئی راستہ آپ کے پاس نہیں**۔ اور ایسا ہی رہا، 1967 تک۔

ماخذ Hewish, Bell et al. (1968) — a rapidly pulsating radio source

76

بُنے ہوئے راستوں والا آسمان

قسم ہے راستوں والے بُنے ہوئے آسمان کی

سورہ ذاریات — آیت 7

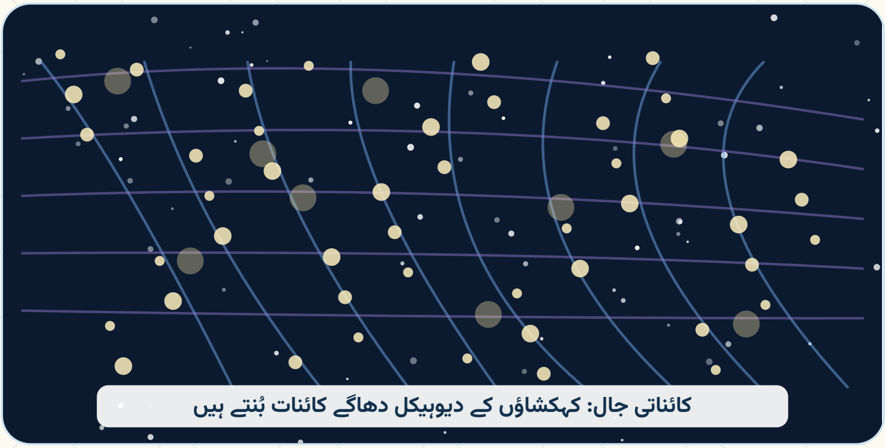

کائنات کا عظیم نقشہ: بکھری ہوئی کہکشائیں نہیں، بلکہ دھاگوں اور گرہوں کا بُنا ہوا جال

آسان لفظوں میں

اگر آپ پوری کائنات کو بہت دور سے دیکھیں تو آپ کو بکھرے ہوئے ستارے نظر نہیں آئیں گے۔ آپ کو کچھ ایسا نظر آئے گا جیسے **بُنا ہوا کپڑا یا دھاگوں کا جال**: کہکشاؤں کے لمبے لمبے دھاگے، اور اُن کے بیچ بہت بڑے کالے خلا۔ اور عربی میں «الحُبُک» کا معنیٰ ہے: **وہ مضبوط بُنائی جس میں راستے ہوں**۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

لوگوں کے نزدیک آسمان ایک ہموار گنبد تھا جس میں روشنی کے نقطے جڑے ہوئے تھے، نہ کوئی ساخت، نہ شکل، نہ ترتیب۔ کائنات کی کوئی «مجموعی شکل» بھی ہو، یہ خیال تو زیرِ بحث ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

پچھلی چند دہائیوں میں رصد گاہوں نے لاکھوں کہکشاؤں کے سہ ابعادی نقشے تیار کیے (SDSS منصوبہ اور 2dF سروے)، تو حیران کن نتیجہ سامنے آیا: کہکشائیں بےترتیب بکھری ہوئی نہیں، بلکہ **«کائناتی جال» (Cosmic Web)** کی صورت میں مرتّب ہیں — کہکشاؤں کے دیوہیکل دھاگے اور دیواریں جو بہت بڑے خالی خلاؤں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور جو تصویر بنتی ہے وہ حیرت انگیز حد تک ایک بُنے ہوئے کپڑے سے ملتی ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

«الحُبُک» «حِباک» کی جمع ہے، اور عربی لغات میں اِس کا معنیٰ ہے: کسی مضبوطی سے بُنی ہوئی چیز میں ایک دوسرے میں پیوست راستے، جیسے پانی پر لہروں کا نشان یا ریت پر پڑی سلوٹیں۔ اور آج جو سائنسی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ بالکل یہی ہے: «Filaments» یعنی **دھاگے**۔ چودہ صدیوں بعد ایک عربی لفظ کا جدید سائنسی اصطلاح کے ساتھ ایسے نادر اور مخصوص معنیٰ میں مل جانا، اُن چیزوں میں سے نہیں جو اتفاقاً ہوتی ہیں۔

مآخذ Sloan Digital Sky Survey · Bond, Kofman & Pogosyan (1996) — the cosmic web, Nature 380

77

پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے، جھاڑنے والے

پس قسم ہے پیچھے ہٹ کر چھپ جانے والوں کی ۞ جو چلتے ہیں اور جھاڑ ڈالتے ہیں

سورہ تکویر — آیات 15–16

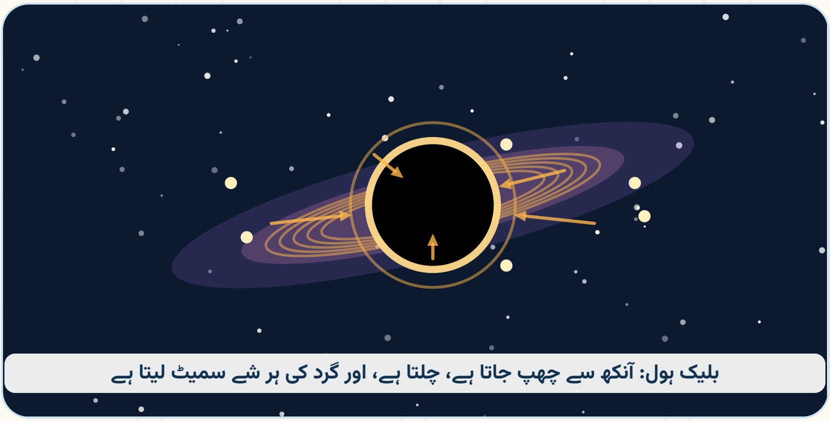

بلیک ہول: آنکھ سے چھپ جاتا ہے، چلتا ہے، اور گرد کی ہر شے سمیٹ لیتا ہے

بلیک ہول اپنے گرد کی گیس اور ستارے کائناتی جھاڑو کی طرح نگل لیتا ہے

آسان لفظوں میں

خلا میں کچھ اجسام ایسے ہیں جن میں تین صفتیں ہیں: وہ **چھپ جاتے ہیں** اور دکھائی نہیں دیتے، وہ زبردست رفتار سے **چلتے ہیں**، اور اپنے گرد جو کچھ ہے اُسے **جھاڑ کر** نگل لیتے ہیں۔ یہی تینوں صفتیں ہیں جن کی اللہ یہاں قسم کھا رہا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

پوری دنیا میں کسی **غیر مرئی** آسمانی جسم کا تصوّر تک نہ تھا۔ جسم یا تو نظر آتا ہے تو موجود ہے، یا نظر نہیں آتا تو موجود نہیں۔ رہا یہ کہ آسمان میں کوئی بہت بڑی چیز ہو جسے کوئی آنکھ کبھی نہ دیکھے، اور وہ اپنے گرد کی ہر چیز نگلتی جائے — اِس کا تو کسی نے تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سیاہ شگاف (بلیک ہول): ایسے اجسام جن کی کثافت اِس قدر ہے کہ روشنی تک اُن سے نکل نہیں پاتی، چنانچہ وہ اپنی فطرت ہی سے **بالکل پوشیدہ** ہیں۔ وہ اپنی کہکشاؤں میں گھومتے اور چلتے ہیں، اور گیس، گرد اور ستاروں کو کھینچ کر نگل لیتے ہیں۔ پہلے بلیک ہول کی براہِ راست تصویر 2019 میں لی گئی (کہکشاں M87 میں)، اور اُن کے ثبوت پر کام کو 2020 میں نوبل انعام ملا۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تینوں لفظ حیران کن حد تک دقیق ہیں: «الخُنَّس» «خَنَس» سے ہے، یعنی **چھپ گیا اور سمٹ گیا**؛ «الجَوارِ» یعنی **چلنے والے، حرکت میں رہنے والے**؛ «الكُنَّس» «كَنَس» سے ہے، یعنی **اپنے گرد کی چیزیں سمیٹ کر نگل لینا** (اِسی سے «مِكنَسہ» یعنی جھاڑو ہے، اور اِسی سے «کِناس» ہے، وہ بھٹ جس میں ہرن چھپ جاتا ہے)۔ دو آیتوں میں تین صفتیں، اور تینوں ایک ہی ایسی چیز پر صادق آتی ہیں جو بیسویں صدی سے پہلے معلوم ہی نہ تھی۔ اور یہ بھی دیکھیے کہ قرآن میں قسم کسی عظیم چیز ہی کی کھائی جاتی ہے۔

مآخذ Nobel Prize in Physics 2020 · Event Horizon Telescope (2019) — the first image of M87*

زمین اپنے بوجھ نکال دیتی ہے

جب زمین اپنے بھونچال سے ہلا دی جائے گی، اور زمین اپنے بوجھ نکال باہر ڈالے گی

سورہ الزلزال – آیات 1-2

زلزلوں اور زمینی تہوں کی حرکت ہی نے دھاتوں اور تیل کو ہماری پہنچ تک اٹھایا

آسان لفظوں میں

آج ہم جو سونا، دھاتیں اور تیل نکالتے ہیں وہ سب زمین کی گہرائیوں میں دفن تھے۔ اور انہیں سطح کے قریب لانے والی چیز **زلزلے اور زمین کی حرکت** ہے، لاکھوں برسوں کے دوران۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

زلزلہ سراسر آفت تھا: عمارتوں کا گرنا، زمین کا دھنسنا اور موت۔ کسی نے اسے کسی فائدے سے یا کوئی بھلائی نکالنے سے نہ جوڑا۔ اور «اثقالہا» یعنی زمین کے باطن کے خزانے – یہ مفہوم سننے والوں کے ہاں واضح ہی نہ تھا۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

دنیا کی بیشتر معاشی کانیں **زمینی تہوں کے کناروں** اور زلزلی و آتش فشانی سرگرمی کے علاقوں میں واقع ہیں۔ تہوں کی حرکت ہی دھات سے بھری چٹانوں کو گہرائی سے قشر تک دھکیلتی ہے، اور گرم سیال ہی سونے اور تانبے کو رگوں میں مرتکز کرتے ہیں۔ اگر یہ سرگرمی نہ ہوتی تو زمین کے سارے خزانے ہمیشہ کے لیے ہماری پہنچ سے دور رہتے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

آیت دو ایسے واقعوں کو جوڑتی ہے جنہیں عام عقل نہیں جوڑتی: زلزلہ ← بوجھوں کا نکلنا۔ اور یہی وہ بات ہے جو علمِ کان کنی طے کرتا ہے۔ اور لفظ «اثقال» حیرت انگیز حد تک باریک ہے: قیمتی دھاتیں – جیسے سونا اور پلاٹینم – **عناصر میں سب سے زیادہ کثیف** ہیں، اور لوہے کے ساتھ گہری وابستگی رکھتی ہیں، سو جس دن زمین کی تہیں الگ ہوئیں یہ لوہے کے پیچھے اس کے مرکز تک اتر گئیں اور قشر کو اپنے آپ سے تقریباً خالی چھوڑ گئیں؛ اب یہ ہم تک اسی طاقت سے پہنچتی ہیں جو انہیں اوپر اٹھائے۔ سو انہیں اُسی طبیعی خاصیت کے نام سے پکارا گیا جو انہیں سب سے ممتاز کرتی ہے۔

مچھر، اور جو اس سے آگے ہے

بے شک اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثال بیان کرے — مچھر کی، یا جو اس سے بھی آگے ہو

سورہ بقرہ — آیت 26

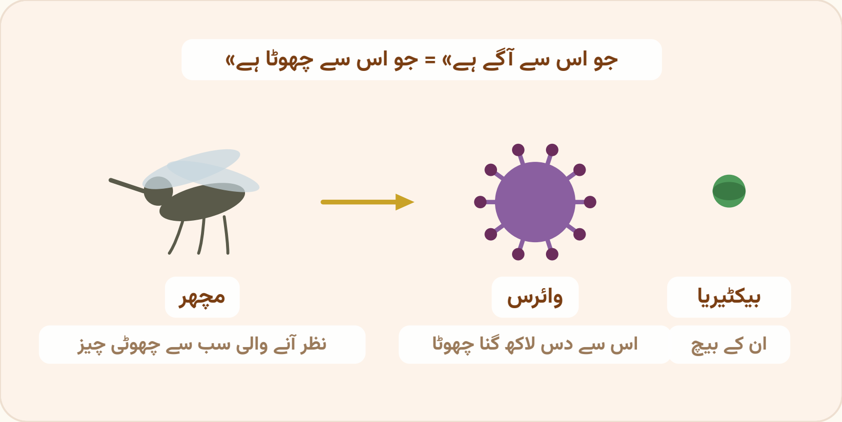

بیکٹیریا اور وائرس کے مقابلے میں مچھر ایک دیو ہے

آسان لفظوں میں

قرآن نے سب سے چھوٹی چیز کی مثال دی جو لوگ دیکھتے ہیں — مچھر — پھر فرمایا: **«فما فوقها»**۔ اور عربی میں «فوق» **چھوٹائی میں اور بڑھ جانے** کے معنی میں بھی آتا ہے، یعنی: اور جو اس سے بھی چھوٹا ہو۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

مچھر ممکنہ چھوٹائی کی حد تھا: سب سے چھوٹی مخلوق جسے آنکھ دیکھ سکے اور اس کے اعضا میں امتیاز کر سکے۔ اس سے چھوٹی زندگی کا تصور ہی نہ تھا، کیونکہ جو نظر نہ آئے اس کا وجود معلوم نہیں ہوتا۔ اور معاملہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ خوردبین ایجاد ہوئی۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

مچھر نسبتاً ایک بڑی مخلوق ہے: اس کی لمبائی تقریباً 6 ملی میٹر ہے۔ اکیلے اس کے جسم میں **لاکھوں بیکٹیریا** بستے ہیں، اور اس پر ایسے وائرس ہیں جو بیکٹیریا سے سیکڑوں گنا چھوٹے ہیں۔ اور ایک ہی مچھر کی ساخت نہایت پیچیدہ نکلی: سیکڑوں عدسوں والی مرکب آنکھ، ایک سونڈ جس میں چھیدنے، چوسنے اور خون جمنے سے روکنے والا مادہ داخل کرنے کے لیے چھ الگ آلات ہیں، اور ایسے پر جو ایک سیکنڈ میں 600 بار پھڑپھڑاتے ہیں۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

سیاق ہی فیصلہ کن ہے۔ آیت اس مقام پر ہے کہ اللہ **چھوٹی چیز سے** مثال دینے میں نہیں شرماتا، ان لوگوں کے جواب میں جنہوں نے مکھی اور مکڑی کے ذکر کا مذاق اڑایا تھا۔ چنانچہ سیاق سے ہم آہنگ معنی یہ ہے: اور نہ اس سے جو **چھوٹائی میں اس سے بھی بڑھ کر** ہو۔ اور یہ استعمال صحیح عربی ہے، جیسے کہا جاتا ہے «یہ جہالت میں اس سے بھی فوق ہے»۔
چنانچہ متن ضمناً ایسی مخلوقات کے وجود کو ثابت کرتا ہے جو سب سے چھوٹی نظر آنے والی چیز سے بھی چھوٹی ہیں، ایسے زمانے میں جب مچھر چھوٹائی کے بارے میں انسانی علم کی حد تھا۔

مآخذ: Leeuwenhoek (1674–1676) — the microscopic world

قومِ لوط... جس کا اوپر کا حصہ نیچے کر دیا گیا

سو جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اُس کا اوپر کا حصہ نیچے کا حصہ کر دیا، اور اُس پر تہ بہ تہ پکی مٹّی کے پتھر برسائے

سورہ ہود – آیت 82

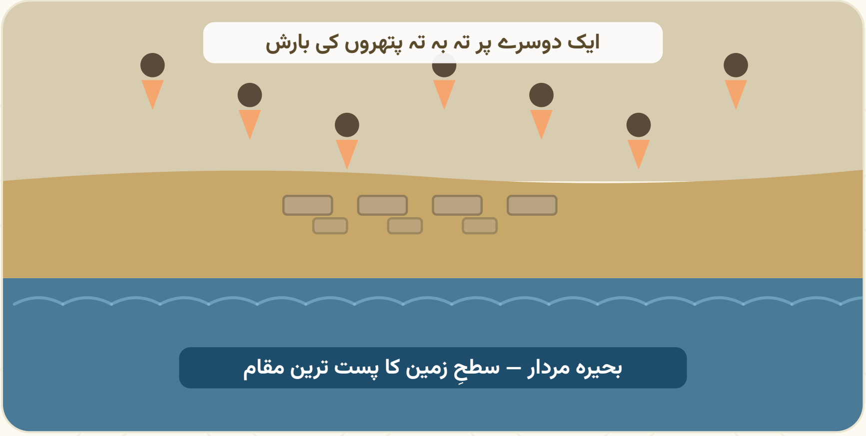

ایک علاقہ جو دھنسا اور اُلٹ گیا، اور اُسے سخت کھارے پانی نے ڈھانپ لیا

آسان لفظوں میں

آیت کہتی ہے کہ قومِ لوط کا شہر **اُلٹ کر اوندھا ہو گیا**، پھر اُس پر ایسے پتھر برسے جو ایک دوسرے پر تہ بہ تہ جمے ہوئے تھے۔ اور ارضیات بتاتی ہے کہ یہ اُسی علاقے میں کیسے پیش آتا ہے۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

دھنسنا اور اُلٹ جانا محض غیبی سزا سمجھا جاتا تھا، جس کے پیچھے کوئی قدرتی سبب نہ ہو۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ وہ علاقہ ایک بہت بڑے زمینی شگاف پر واقع ہے، نہ یہ کہ اُس کے اندر گیسیں، تارکول اور گندھک ہیں۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

بحیرۂ مردار کا علاقہ **بحیرۂ مردار کے تحوّلی شگاف** پر واقع ہے – دنیا کے سب سے زیادہ زلزلہ خیز شگافوں میں سے ایک – اور یہ کرۂ ارض کی خشکی کا سب سے نیچا مقام ہے۔ اور یہ علاقہ قدرتی تارکول، گندھک اور آگ پکڑنے والی گیسوں سے بھرپور ہے۔ اور محققین نے یہ رائے دی ہے کہ ایک شدید زلزلے نے **مٹی کے سیّال ہو جانے اور دھنسنے** اور اُس کی تہوں کے اُلٹ جانے کو جنم دیا، ساتھ ہی جلتے ہوئے مادے اُچھلے جو اُس علاقے پر آ گرے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

تین لفظ سارا وصف اُٹھائے ہوئے ہیں۔ «**ہم نے اُس کا اوپر کا حصہ نیچے کا حصہ کر دیا**»: تہوں کا مکمل عمودی اُلٹ جانا، محض ڈھا دینا نہیں – اور ارضیات میں دھنسنے اور اُلٹنے کا بیان یہی ہے۔ اور «**سِجّیل**»: ایک ایسا لفظ جو پتھر اور سخت ہو جانے والی مٹی دونوں کو جمع کرتا ہے۔ اور «**منضود**»: یعنی ایک دوسرے پر تہوں میں جما ہوا – اور یہ اُس علاقے کی تہ دار رسوبی چٹان کا باریک بیان ہے۔ سو یہ متن ایک ہم آہنگ قدرتی سبب بیان کر رہا ہے، کوئی مبہم خیالی تصویر نہیں۔

مآخذ [Bab edh-Dhra – the southern Dead Sea plain] · [The Dead Sea – the lowest land on earth]

اِرَم، ستونوں والی... دفن شدہ شہر

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا ۞ اِرَم، ستونوں والی ۞ جس کے مانند شہروں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا

سورہ فجر — آیات 6-8

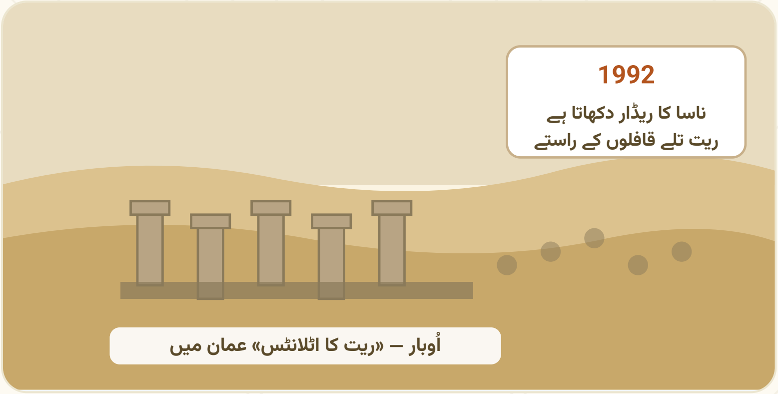

اونچے میناروں والا ایک قلعہ جو ہزاروں سال بعد رُبع الخالی کے ریت کے ٹیلوں کے نیچے سے نکلا

آسان لفظوں میں

قرآن نے ایک عظیم شہر کا ذکر کیا جو **ستونوں** والا تھا اور جس کے مانند کوئی نہ بنایا گیا، اور کہا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اور لوگ اُسے افسانہ سمجھتے رہے... یہاں تک کہ سیّاروں کے ریڈار نے رُبع الخالی کی ریت کے نیچے ایک دفن شدہ آبادی ظاہر کر دی جس کے چھپے ہونے کا کسی کو گمان نہ تھا۔

اُس وقت لوگ کیا سمجھتے تھے؟

رُبع الخالی میں بے انتہا ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور مغربی مؤرخین «عاد» اور «اِرَم» کو عربوں کے افسانوں میں شمار کرتے تھے، کیونکہ اُن کا نہ کوئی نشان تھا نہ دوسرے مصادر میں کوئی ذکر۔ اور صحرا کوئی ایسا راز نہیں سنبھالتا جو اُس کی سطح سے دکھائی دے۔

آج سائنس کیا کہتی ہے؟

سن 1992 میں نکولس کلاپ کی قیادت میں ایک ٹیم نے ناسا کے خلائی شٹل کے ریڈار کی تصویریں استعمال کیں، تو ریت کے نیچے **قدیم قافلوں کے راستے ظاہر ہوئے جو ایک ہی نقطے پر آ ملتے ہیں**، عمان کے صوبہ ظفار میں **الشِصر** کے مقام پر۔ اور کھدائی سے ایک آٹھ پہلو قلعہ نکلا جس کے **اونچے مینار** تھے، اور ایک ایسے شہر کے آثار جو اپنے نیچے ایک چونے کے گڑھے میں دھنس گیا تھا۔ اور عالمی اخبارات نے یہ خبر «اُوبار: ریت کا اٹلانٹس» کے نام سے شائع کی۔ مگر یہ اخباری سرخی ہے، ماہرینِ آثار کا فیصلہ نہیں؛ کیونکہ الشِصر کا خود اِرَم کے ساتھ تعلق ثابت نہیں ہوا، اور قرآن نے جس شہر کا ذکر کیا اُس کی جگہ آج بھی نامعلوم ہے۔

یہ قطعی معجزہ کیوں ہے؟

قرآنی وصف نے اِس شہر کو ایک خاص صفت کے ساتھ خاص کیا: «**ستونوں والی**» — یعنی اونچے ستون یا مینار۔ اور یہ کسی بھی شہر کی عام صفت نہیں؛ جزیرۂ عرب کے شہر تو مٹی کے گھر اور خیمے تھے۔ پھر مزید کہا: «**جس کے مانند شہروں میں کوئی پیدا نہیں کیا گیا**» — یعنی اُس کا تعمیری تفرّد۔ اور ریت کے نیچے سے واقعی اونچے مینار نکلے، اگرچہ ابھی یہ ثابت نہیں ہوا کہ الشِصر ہی اِرَم ہے۔ اور سب سے اہم یہ کہ قرآن نے اُس کا ذکر **ایک واقعی تاریخ** کے طور پر کیا، افسانے کے طور پر نہیں، ایسے وقت میں جب کسی کے پاس اُس کی کوئی دلیل نہ تھی، اور یہ بات 14 صدیوں تک اُس پر اعتراض بنی رہی، یہاں تک کہ ریڈار آ گیا۔

مآخذ Nicholas Clapp — *The Road to Ubar*, 1998 · NASA radar imagery and the search for Ubar